ماہنامہ
دخترانِ اسلام
لاہور
نومبر 2025ء

عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب

حکیم الامت کے افکار

خوش اخلاقی اور نفسیاتی صحت

مراکزِ علم چراغِ ہدایت

بچوں کی پرورش اور والدین کی ذمہ داری

پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی معرکہ آراء تصانیف

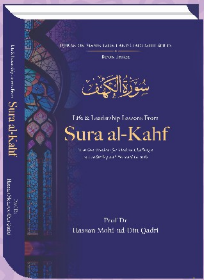

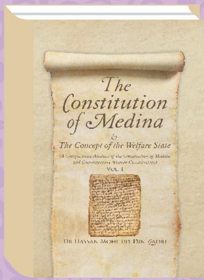

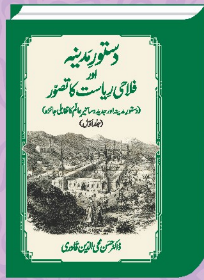

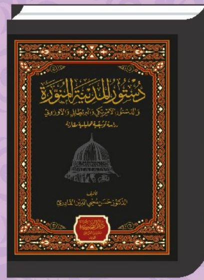

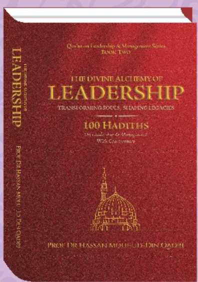

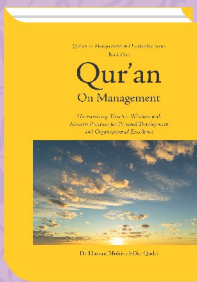

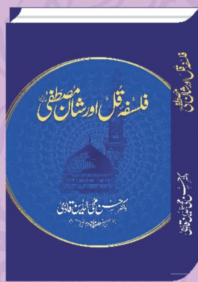

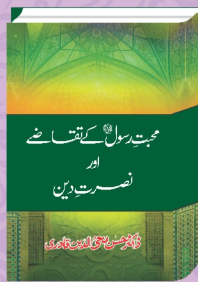

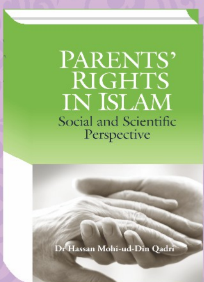

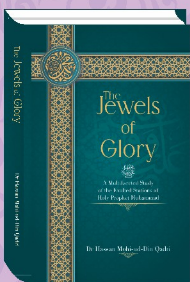

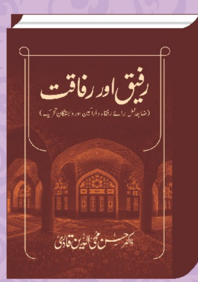

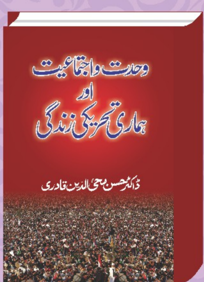

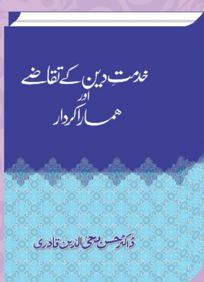

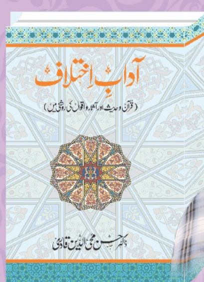

خواتین میں بیداریٔ شعور و آگہی کیلئے کوشاں

ماہنامہ دخترانِ اسلام لاہور

جلد: 32 شمارہ: 10 / جمادی الاول / جمادی الثانی ۱۴۴۷ھ / نومبر 2025ء

زیر سرپرستی

بیگم رفعت جبین قادری

چیف ایڈیٹر

قرۃ العین فاطمہ

فہرس

اداریہ (علم کی ضرورت واہمیت مصطفوی تعلیمات کی روشنی میں)		06
خطاب عشقِ حقیقی اور عشق، مجازی	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	08
حکیم الامت کے افکار	حافظہ عائشہ رشید	19
مثنوی مولائے روم اور تلاشِ راہِ حق	خدیجہ خان	28
بچوں کی پرورش اور والدین کی ذمہ داری	ماہ رخ رانا	37
خوش اخلاقی اور نفسیاتی صحت	عائشہ بتول	45
خاندانی استحکام: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں	سمیہ اسلام	52
مراکزِ علم، چراغِ ہدایت	حافظہ سحر عنبرین	57
الفیوضات المحمدیہ		64
My Comfort Place (Sadia Batool)		66
Compassion for Animals A Seerah-Based Pespective (Sadaf Maqbool)		72

مجلس مشاورت

لبنیٰ مشتاق

ارشاد اقبال اعوان

جویریہ افضل

نور اللہ صدیقی

ڈاکٹر شاہدہ مغل

ڈاکٹر فرخ سہیل

مسز فریدہ سجاد

ڈاکٹر محمد اقبال چشتی

رائٹرز فورم

آسیہ سیف، سعدیہ کریم

جویریہ سحر ش، جویریہ وحید

ماریہ عروج، سُمیّہ اسلام، جویریہ افضل

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم گرافکس: عبدالسلام

فوٹوگرافی: قاضی محمود الاسلام

مجلّہ دخترانِ اسلام میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں، ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدلِ اشتراک

قیمت فی شمارہ -60 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، مشرقِ بعید، امریکہ 15 ڈالر

مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، یورپ، افریقہ 12 ڈالر

سالانہ خریداری -700 روپے

رابطہ ماہنامہ دخترانِ اسلام 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور | فون نمبرز: 3-042-5169111 فیکس نمبر: 042-35168184

Visit us on: www.minhaj.info

E-mail:sisters@minhaj.org

فرمانِ الٰہی

قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر، ۳۹: ۵۳)

’’آپ فرما دیجیے: اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر لی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے، وہ یقینا بڑا بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

(عرفان القرآن)

فرمانِ نبوی ﷺ

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ:

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنَّ الشَّمْسَ تَدْنُو يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يَبْلُغَ الْعَرَقُ نِصْفَ الْأُذُنِ، فَبَيْنَاهُمْ كَذٰلِكَ اسْتَغَاثُوا بِآدَمَ، ثُمَّ بِمُوسَى، ثُمَّ بِمُحَمَّدٍ ﷺ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔

’’حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز سورج لوگوں کے بہت قریب آ جائے گا یہاں تک کہ (اس کی تپش کے باعث لوگوں کے) نصف کانوں تک (پسینہ) پہنچ جائے گا لوگ اس حالت میں (پہلے) حضرت آدم سے مدد مانگنے جائیں گے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے، پھر بالآخر (ہر ایک کے انکار پر) حضرت محمد مصطفی ﷺ سے مدد مانگیں گے۔‘‘

(المنہاج السوی، ص: ۵۲۰)

خواب

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل وفرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

(کلیاتِ اقبال)

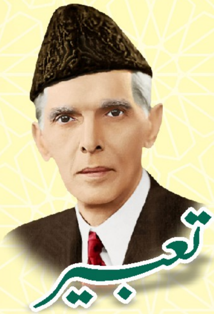

تعبیر

قائداعظم نے 17 ستمبر 1944ء کو گاندھی جی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا: قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ یہ مذہبی رسوم سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق تک، اخلاق سے لے کر انسدادِ جرائم تک، زندگی میں سزا و جزا سے لے کر آخرت کی جزا و سزا تک غرض کہ ہر قول و فعل اور ہر حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہذا جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں تو حیات اور مابعد حیات کے ہر معیار اور پیمانے کے مطابق کہتا ہوں۔”

(قائداعظمؒ کا خط، 17 ستمبر 1944ء)

تکمیل

کوئی تحریک جو فکر، نظریہ یا Religious Idelogy کو بنیاد بنائے اسے دو بڑے چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک چیلنج یہ کہ جب وہ تحریک وسعت، اعتدال اور توازن پیدا کر رہی ہوتی ہے تو اس کی مخالفتیں ہوتی ہیں۔ نیز اس کے وجود کو ختم کرنے کے لیے سازشیں ہوتی ہیں۔ اس صورتحال میں تحریکوں کو جانثار، قربانی دینے والے اور ڈٹے رہنے والے کارکنان کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ سنگل پوائنٹ ایجنڈا پر لوگوں کا Brain Wash کر کے انہیں جانثار بنانا آسان ہے لیکن جو تحریک بذات خود اسلام کی کلیت، جامعیت اور اعتدال کے ابلاغ کا کام کر رہی ہو، اس کے لیے کارکنان کی Brain Washing ناممکن ہے۔

(شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری)

اداریہ

علم کی ضرورت و اہمیت مصطفویؐ تعلیمات کی روشنی میں

اللہ رب العزت نے علم کے نور کے سبب سے اُمت محمدیہ کو مسجود ملائکہ اور اشرف المخلوقات ہونے کے شرف سے نوازا، وحی کا پہلا حرف اقراء نازل ہوا اور رب کائنات نے اُمت مسلمہ کو حکم دیا کہ اگر دنیوی و اخروی کامیابیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو علم سے محبت کا دائمی رشتہ قائم کر لیں۔ جب تک اُمت کا علم و تحقیق کے ساتھ رشتہ جڑا رہا دنیا کی حاکمیت اور امامت اُمت مسلمہ کا مقدر بنی رہی اور جیسے ہی یہ رشتہ کمزور ہوا تو حاکم محکوم ہو گئے، علم کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب اللہ رب العزت نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کو منصبِ نبوت عطا فرمایا تو آپ ﷺ نے تعلیمات ربانی کے ابلاغ کے لئے سب سے پہلے صفہ کے مقام پر علمی درس گاہ قائم فرمائی جہاں صحابہ کرامؓ حضور نبی اکرم ﷺ سے علم و حکمت کا درس لیتے اور واپس جا کر اپنے خاندانوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرتے، قرب و جوار میں رہنے والے صحابہ کرامؓ روزانہ تشریف لاتے اور درس میں شامل ہوتے اور دور دراز علاقوں میں رہائش پذیر صحابہ صفہ میں ہی قیام کرتے اور علم و حکمت کے موتی چنتے۔ بعدازاں صحابہ کرام کا یہ معمول رہا کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ جیسے جلیل القدر صحابی صرف ایک حدیث مبارکہ کے سماع کے لئے پورا مہینہ مشقت فرماتے، یہی وہ علم کی لگن، شوق اور جذبہ تھا کہ اُمت محمدیہ اپنی مثال آپ بن چکی تھی، آج بھی اُمت مسلمہ کو دگرگوں حالات کا سامنا ہے، یہ حالات علم سے منہ موڑنے کے سبب

سے ہیں، ہمیں حضور نبی اکرم ﷺ کی مبارک تعلیمات سے ہی آج کے دور کے فتنوں اور مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور وہ حل علم سے محبت اور علمی قدروں کا احیاء ہے۔ منہاج القرآن کے بانی و سرپرست اعلیٰ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اس وقت علمی قدروں کے احیاء کی فی زمانہ ایک معتبر اور توانا آواز ہیں، آپ نے ایک ہزار سے زائد کتب تصنیف فرمائیں جن میں 700 سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں، علم و آگہی کے فروغ کی یہ ایک قابلِ فخر اور قابلِ تقلید مثال ہے۔
شیخ الاسلام نے علوم القرآن و علوم الحدیث کے احیاء کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تحصیل کا بھی شعور اجاگر کیا اور اس ضمن میں جدید تعلیمی ادارے قائم کئے جہاں اس وقت لاکھوں طلبا و طالبات کسب علم و فیض کر رہے ہیں۔ عہدِ نبوی ﷺ میں دروس قرآن و حدیث میں شرکت کرنے والے اصحاب رسول اللہ ﷺ علم حاصل کرنے کے بعد اپنے اہل خانہ کو اُس علم سے روشناس کرواتے جو وہ بارگاہ رسالت ﷺ سے حاصل کرتے تھے۔ شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ نے انہی سنتوں کا احیاء کرتے ہوئے مراکز علم کا تصور پیش کیا ہے کہ جب تک ہم اپنے گھروں کو مراکز علم میں تبدیل نہیں کریں گے اُس وقت تک سوسائٹی سے کفر و الحاد کے سائے نہیں چھٹیں گے، گھر معاشرے کا بنیادی یونٹ اور اکائی ہے، اگر ہم من حیث المجموع معاشرے کو علم و امن اور حقوق و فرائض کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ابتداء اپنے آپ سے اور پھر اپنے اہل خانہ سے کرنی چاہیے، یہ حکم خداوندی بھی ہے اور سنت مصطفی ﷺ بھی ہے کہ ہم اپنے گھروں کو مراکزِ علم میں تبدیل کریں، منہاج القرآن کی جملہ قیادت مراکزِ علم کے فروغ و احیاء اور قیام و تشکیل کے لئے برسرپیکار ہے، منہاج القرآن سے وابستہ رفقائے کار، وابستگان و کارکنان اپنے گھروں کو مراکز علم بنانے کے ساتھ ساتھ عزیز و اقارب اور دوست احباب کو بھی اس کی دعوت دیں، ہم آج سوسائٹی میں جھوٹ، منافقت، چھینا جھپٹی، لاقانونیت، بدعہدی، تکبر، رعونت، بدنظمی میں پائے جانے کے گلے کرتے ہیں مگر ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو ان فتنوں سے نجات کے لئے سنجیدہ ہیں؟۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم محض گلے اور شکوے کرنے کی بجائے عملاً اصلاحِ احوال اور اصلاح معاشرہ کے قرآنی احکامات کی بجاآوری کرتے ہوئے مراکز علم مہم کو کامیاب بنائیں۔

(ایڈیٹر: دختران اسلام)

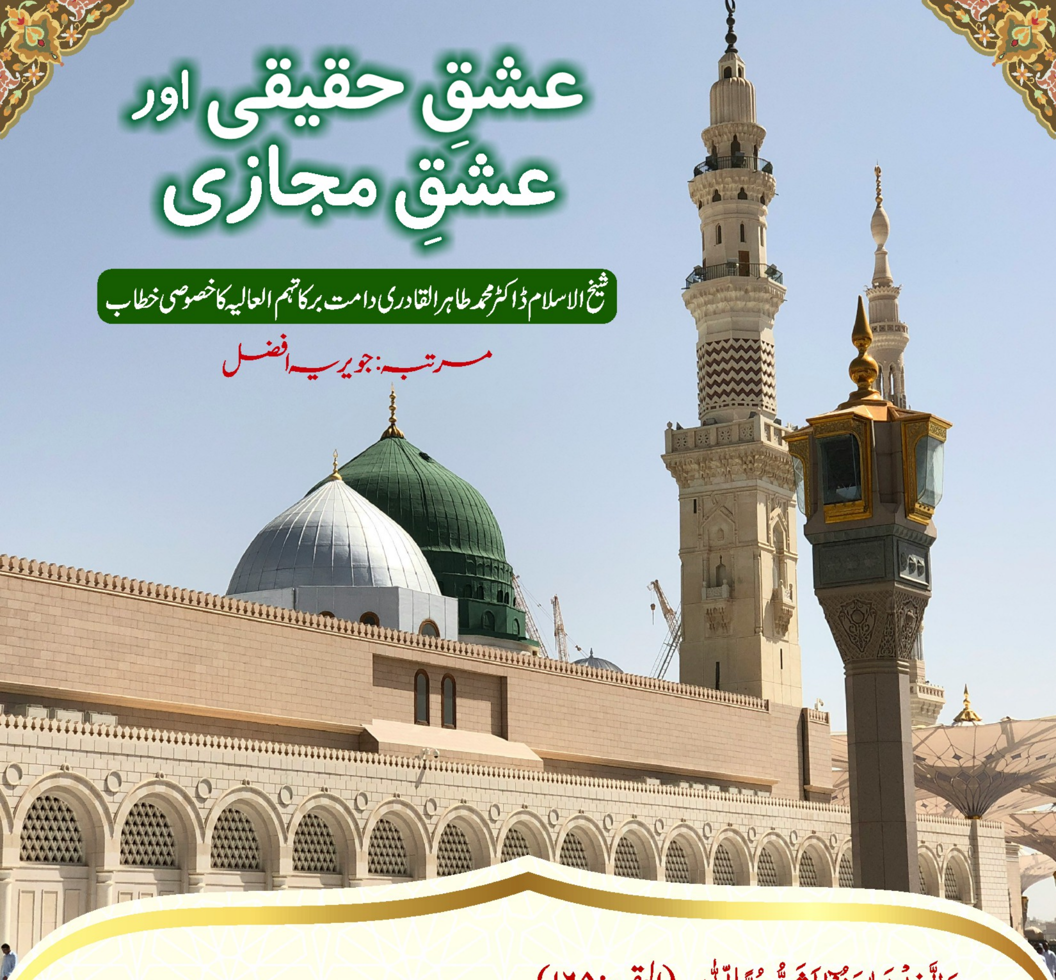

عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ کا خصوصی خطاب

مرتبہ: جویریہ افضل

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (البقرہ: ۱۶۵)

” اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔“

اللہ رب العزت قرآن میں بہت سے تمثیلی مطالعات کرواتا ہے جیسے مچھر، عنکبوت (مکڑی)، شہد کی مکھی، پھولوں، پودوں اور پھلوں وغیرہ کا تمثیلی مطالعہ اللہ رب العزت نے کلام حکیم میں کروایا۔ اس سے بہت کچھ سامان عبرت ونصیحت حاصل ہوتا ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے ساری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ نیز تمام محبتوں کے تقاضے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

انسان کی تخلیق میں عنصر محبت

اللہ نے سورہ العلق میں انسان کی تخلیق کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (العلق: ۱-۲)

” (اے حبیب!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھیے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایا۔اس نے انسان کو (رحمِ مادر میں) جونک کی طرح معلق وجود سے پیدا کیا۔“

لفظ ’علق‘ کے تین معانی ہیں۔ ایک معنی غلط العام ہے جو کہ خون کا قطرہ (Clot of blood) ہے۔ کیونکہ انسانی تخلیق میں Sperm اور Ovum کے ملاپ سے رحم مادر میں Implantation of egg ہوتا ہے۔اس سے آگے پھر Uterus میں Embrio بنتا ہے۔ اس پورے عمل میں انسان کی تخلیق تک خون کا قطرہ کسی مرحلے میں شامل نہیں۔

علق کے باقی دو معانی درست ہیں: ایک معنی مرئی، مادی یا غیر محسوس ہے جبکہ دوسرا معنی روحانی، غیر مرئی اور محسوس ہے۔ علق، جونک کی مانند ایک شے ہوتی ہے جو رحمِ مادر میں لٹک جاتی ہے۔ 21 ویں دن اس شے کو جونک کی شکل میں Uterus کے endomentrium میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس مادی معنی کے اعتبار سے علق کی ایک خوبی ہے کہ وہ جونک کی مانند ماں کے رحم میں چپک جاتا ہے جیسے جونک چپک کر خون چوستی ہے۔

علق محبت کا دوسرا معنی روحانی ہے کہ علق، علاقہ / تعلق کا مادہ ہے اور تعلق محبت کا بنیادی عنصر ہے۔ گویا مراد یہ ہوئی کہ ہم نے انسان کو پیدا ہی عنصر محبت سے کیا ہے۔ انسان کی انسانیت ایسی شے ہے جو جڑے بغیر رہ نہیں سکتی کیونکہ اس کی تخلیق علق سے ہوئی۔ اسی وجہ سے انسان کو دیگر انسانوں سے، باپ کو بیٹوں سے بیٹیوں کو باپ سے، ماں کو اولاد سے اور اولاد کو ماں سے انس ہوتا ہے۔ چنانچہ جڑے رہنے میں ہی زندگی ہے اور انسان کی اصل یا بنیادی خاصیت ہی کسی کے ساتھ جڑنا ہے۔

لفظ انسان

لفظ انسان کے دو مادے ہیں؛ انس (اسے انس ہو گیا)، گویا جس وجود کو انسان کہتے ہیں وہ کسی سے انس و محبت کرتا ہے۔ جو انس نہیں کرتا وہ انسان نہیں ہے بلکہ وہ حیوان بھی نہیں ہے کیونکہ حیوان بھی انس کرتا ہے۔

بعض نے کہا کہ انسان کا لفظ نَسِیَ سے بنا، اس سے مراد ہے بھول جانا۔ گویا انسان اسے کہتے ہیں جو بھول جائے یا جس سے خطا ہو جائے۔ انس کرنا اور بھول جانا، یہ دونوں چیزیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ اللہ رب العزت نے جنت میں پہلا انسان یعنی حضرت آدمؑ کو جب پیدا فرمایا تو اس کے اندر دونوں مظاہر انس اور نسیان کو ظاہر کیا۔ حضرت حواؑ کے ساتھ ان کا طبعی انس ظاہر فرمایا اور پھر جنت میں درخت کے قریب جانے کی بھول اور نسیان کا مظہر بھی پہلے انسان میں ظاہر کیا۔

انسان میں جب انس پیدا ہو جائے اور وہ تعلق، محبت، مودت کی صورت میں بڑھتا چلا جائے اور پھر محبت کے آخری درجے، عشق تک جا پہنچے تو ہر وہ چیز جو اس کے محبوب سے متناقض ہے، محبوب سے غیر ہے یا محبوب کو اچھی نہیں لگتی تو وہ شخص اسے بھول جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے محبوب کو یاد رکھتا ہے ویسے محبوب کی محبوب و مرغوب چیزوں کو یاد رکھتا ہے۔ انس کے اندر ایک قوت نسیان ہے کہ وہ محبوب سے مانوس رکھتا ہے اور محبوب کے غیر سے غیر مانوس کر دیتا ہے۔

جس کو محبوب حقیقی سے محبت ہو گئی اور بڑھتے بڑھتے عشق تک جا پہنچی تو وہ پھر ماسوی اللہ کو یکسر بھول جاتا ہے۔ اسی طرح اگر محبت، دنیا اور مال و دولت سے پیدا ہو کر شدت پکڑے تو پھر ایسی محبت، نیکی، حلال و حرام کے فرق، احکام شریعت، عدل و انصاف، انسانیت حتی کہ اللہ کو بھلا دیتی ہے۔ محبت جس طرف کا رخ کرلے اس کے اثرات و نتائج ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جب انسان دنیا کی محبت کی جانب متوجہ ہو جائے تو اسی انسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔ (العادیات:٦)

”بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔“

پھر ایسا انسان جو اللہ کا طالب و ذاکر تھا اور مسجود ملائکہ تھا وہی انسان جب شہوتوں کی مزین کی ہوئی محبتوں میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر وہ نیکی، حلال و حرام، خیر و شر، خون حق اور خون ناحق کو بھول جاتا ہے۔ انسان چونکہ علق سے پیدا ہوا ہے اور اگر وہ علاقہ دنیا سے جوڑے تو پھر یہ تعلق یوں اندھا کر دیتا ہے کہ جائز و ناجائز کے تمام فرق بھول جاتے ہیں۔

محبت انسان کی ترجیحات مقرر کرتی ہے۔ اسی محبت کے میلانات کو بیان کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ۔ (القیامۃ:٢٠)

”حقیقت یہ ہے (اے کفّار!) تم جلد ملنے والی (دنیا) کو محبوب رکھتے ہو۔“

دنیا جس سے فوری طور پر فائدہ ملتا ہے، راحت، جھوٹی عزت اور جھوٹی تسکین قلب ملتی ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ تم اس سے بڑی محبت کرتے ہو۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (الاعلیٰ:١٦)

”بلکہ تم (اللہ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے) دنیاوی زندگی (کی لذتوں) کو اختیار کرتے ہو۔“

جب محبت کسی چیز کی چھا جائے تو زندگی میں ترجیحات مقرر ہو جاتی ہیں۔ پھر دنیا کی محبت میں

آخرت پیچھے پھینک دی جاتی ہے۔ پھر سورہ فجر میں قرآن مجید نے بیان کیا:

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ (الفجر:۲۰)

”اور تم مال و دولت سے حد درجہ محبت رکھتے ہو۔“

مال کی محبت میں پڑ جانے والے کے لیے ہر چیز موخر اور مال مقدم ہو جاتا ہے۔ یہی مال، فرعون، قارون، نمرود اور بد بخت یزید بناتا ہے۔ اسی طرح جس رخ کی محبت ہو جائے، محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ ہر صورت انسان نے محبت کرنی ہی کرنی ہے۔ اللہ نے اسی لیے اولاد، مال، دولت اور عزت وغیرہ جیسے کئی مظاہر محبت بیان فرمائے لیکن ایک محبت اس حسن کی بھی ہے جس حسن پر کبھی زوال نہیں آئے گا، اس کے حسن و جمال میں کبھی کمی نہیں آئے گی اور اس کی قربت کی لذت کا اندازہ اس دنیا کے کسی حسین کی قربت کی لذت سے نہیں ہو سکتا۔

محبت کے اسباب

جس طرح محبت کے مظاہر ہیں اسی طرح محبت کے اسباب بھی ہیں۔ جھوٹی محبتوں کے اسباب طمع، مفاد پرستی، جنس، نفع کا حصول، اوصاف، خواہش وغیرہ ہیں۔ یہ ڈھل جانے والی محبتیں ہیں جن کے اسباب ختم ہو جانے سے محبت پر بھی زوال آتا ہے۔ محبت جس نوعیت کی بھی ہو اس کے اثرات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا کی کسی شے یا ہستی سے محبت ہے تو اسے محبت مجازی کہتے ہیں، اگر جنت، آخرت کی کسی شے سے محبت ہے تو اسے اخروی محبت کہتے ہیں۔ ان سب سے بلند محبت، محبت حقیقی ہے جو کہ خود حق تعالیٰ کی محبت ہے۔

لیلیٰ اور مجنوں کا تعارف

مجنوں ایک تابعی تھا۔ اس کا نام قیس بن ملوح العامری تھا۔ لیلیٰ کا نام لیلیٰ بن مہدی ام مالک العامریہ تھا۔ مجنوں کی پیدائش 24ھ میں ہوئی جو کہ حضرت عثمان غنیؓ کا زمانہ خلافت تھا۔ کئی اقوال کے مطابق لیلیٰ بھی 24ھ کی پیدائش ہے۔ مجنوں اور لیلیٰ دونوں کی وفات 68ھ میں ہوئی۔ لیلیٰ اور مجنوں کی شادی نہ ہوئی تھی۔ لیلیٰ اور مجنوں کا واقعہ کوئی قصہ یا کہانی نہیں ہے۔ اس واقعہ کا ذکر ایک سو سے زائد جلیل القدر ائمہ، مورخین، محدثین اور صوفیاء نے اپنی کتب میں کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کا ذکر امام ابوالفرج علی بن الحسین الاصفہانیؒ نے اپنی 25 جلدوں پر مشتمل کتاب ”کتاب الاغانی“ میں کیا ہے۔ سلف صالحین میں سے محمد بن سائب کلبیؒ، ابو عبدالرحمن النخویؒ، ابوالمنذر محمد بن سائبؒ، ابن الکلبیؒ، ابو عبیدہ معمر البصریؒ وغیرہم نے اپنی تصانیف میں لیلیٰ مجنوں کے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

مجنوں کی کیفیتِ محبت

امام ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء میں لکھا: مجنوں کو محض لیلیٰ کے عشق کی آگ میں جلنا ملا۔ اس کے اعزاء و اقارب اسے حج پر لے گئے کہ شاید اللہ کے گھر کو دیکھے تو اس کی محبت کا رخ بدل جائے۔ جب وہ منیٰ میں پہنچے تو اچانک کسی شخص نے اپنی بیوی یا بیٹی کو آواز دیتے ہوئے کہا "یا لیلیٰ"۔ قیس بن ملوح نے جب یہ سنا تو بے ہوش ہو گیا۔ ساری رات بے ہوش پڑا رہا اور صبح ہوش میں آیا۔ یہ توحیدِ عشق کی ایک کیفیت تھی۔ محبت میں اس قدر صدق آ جائے تو محبوب کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ ہوش میں آ کر اس نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یوں ہے کہ کسی نے مقامِ حیف پر لیلیٰ کا نام لیا۔ جس پر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ ایسا لگا کہ لیلیٰ کے نام کا پرندہ میرے دل میں قید تھا وہ شاید میرے سینے سے اڑ گیا ہے۔ وہ یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ لیلیٰ کسی اور کا بھی نام ہو سکتا ہے۔ عشق کا مقام یہ تھا کہ شرک اس کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ عشق مجازی میں عالم یہ ہے کہ بندہ اپنے محبوب کا نام اور صفت کسی اور کے لیے گوارا نہیں کر سکتا تو اگر کسی کو عشق حقیقی نصیب ہو جائے تو وہ محبت جو اللہ کے لیے قائم ہو گی اس کا ایک ذرہ بھی کسی اور کے لیے دیکھنا یا سننا کیسے گوارا کرے گا۔

امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ مجنوں کی کیفیت یہ ہو گئی کہ محبت بڑھتے بڑھتے جب وہ مایوس ہو گیا تو وہ ہوائے نفس سے پاک ہو گیا، اسے خلوت سے محبت ہو گئی اور اب وہ لیلیٰ کے تصورِ عشق سے گفتگو کرتا تھا۔ اب لیلیٰ عشقِ حقیقی کا ایک عنوان بن گئی تھی جس میں وہ فنا ہو کر اپنے دل سے بات کرتا۔ عشق کی آگ نے مجنوں کے نفس، نفسانیت اور نفسیت کو جلا دیا۔

نفس، نفسانیت اور نفسیت

نفس وہ ہے جو برائی کی طرف ہمیں دھکیلتا ہے جس کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ۔ (یوسف: ۵۳)

"بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے۔"

دنیا، مال و دولت، منصب و جاہ کی محبت حتیٰ کہ میں یہ سب نفس ہے۔ میں کی محبت خود ایک بہت بڑا عشق مجازی ہے اور یہ بت پرستی ہے۔ اپنے اعتراف، منصب، عہدہ، استحقاق اور تعظیم کے ساتھ محبت، یہ سب نفس ہے۔ اگر عشق بڑھتے بڑھتے اس نفس کو درمیان سے نکال دے تو نفس امارہ کے نکل جانے سے نفس مرتا ہے یا کمزور ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود نفسانیت باقی رہتی ہے۔ نفس لوامہ میں بھی نفسانیت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اسی طرح نفس ملھمہ، جس میں خیر کے الہام ہوتے ہیں اور پھر نفس

مطمئنہ جس میں انسان کا نفس خیر پر مطمئن ہو جاتا ہے لیکن نفسانیت اپنا اثر ان چاروں منازل پر دکھاتی ہے۔ ان چار منازل کے بعد پھر نفسیت رہ جاتی ہے۔ پھر انسان نفس راضیہ، مرضیہ اور کاملہ کے مقام پر جاتا ہے اور بالآخر نفس کاملہ کے مقام پر صدا آتی ہے:

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ (الفجر: ۲۷،۲۸)

’’اے اطمینان پا جانے والے نفس تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)۔‘‘

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یا ایتہا النفس المطمئنۃ

ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

جب لوٹ آنے کا حکم آتا ہے تو پھر انسان نفسیت سے بھی پاک ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب بندہ نفس، نفسانیت اور نفسیت سے پاک ہو کر محبوب سے ملتا ہے اور اس کی بارگاہ میں گم ہو جاتا ہے۔ جس طرح مجنوں کو لیلیٰ سے ملنے کی امید نہ رہی اسی طرح جب اللہ کسی سے محبت کرنے لگے اور اسے اپنی محبت کے لیے چن لیتا ہے۔ تب اللہ دنیا سے کہتا ہے کہ اے دنیا! تو میرے اس بندے کے لیے کڑوی بن جا، میرے اس بندے کے لیے تیرے اندر کوئی حسن نہ رہے تاکہ میرا بندہ تجھے دیکھے تو اسے تجھ سے وحشت ہو اور میرا بندہ تیرا گھونٹ نہ بھرے۔ اس طرح اللہ اپنے بندے کو دنیا سے مایوس کر دیتا ہے۔ اس کے دل کو دنیا سے توڑ کر اپنے ساتھ جوڑ لیتا ہے۔ عرفاء کا قاعدہ یہی ہے کہ وصل کے لیے فصل چاہیے یعنی اگر اللہ سے جڑنا مقصود ہو تو پھر ہر اس شے سے کٹنا ہوگا جو اللہ کی متضاد یا اس سے دور کرنے والی ہے۔

محبت کے درجات

اللہ محبت کو درجہ بدرجہ انسان میں منتقل کرتا ہے۔ ایک محبت آثاری ہے جس سے ابتداء ہوتی ہے۔ اسی طرح سے محبت صفاتی، افعالی اور ذاتی بھی محبت کے درجات ہیں۔ جب کسی سے محبت ہو تو اس کے آثار مثلاً شہر، محلے، گلی، کوچے، پسند ناپسند سے محبت ہوتی ہے۔ جس طرح ہمیں مدینہ طیبہ کے گلی کوچوں اور در و دیوار سے محبت ہے۔ اسی طرح اللہ والے، اللہ سے محبت کی انتہا کرتے ہیں تو انہیں لہلہاتے کھیتوں، بہتے دریاؤں، گرتی ہوئی آبشاروں اور پہاڑوں سے محبت ہوتی ہے۔ الغرض اللہ کی مخلوق میں جس طرف نگاہ اٹھاتے ہیں انہیں اللہ کی خلقت و قدرت کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ یہی عشق مجازی میں بھی ہوتا ہے۔

علامہ ابن الجوزیؒ ''المنتظم فی تاریخ الملوک والامم'' میں لکھتے ہیں کہ جب مجنوں مایوس ہو گیا تو وہ جنگلی جانوروں خصوصاً ہرنیوں کے ساتھ وقت گزارنے لگا۔ وہ ہرنیوں میں اپنے محبوب کی کچھ مشابہت دیکھتا تھا۔ جہاں سے ہرنیاں گھاس کھاتی تھیں وہ بھی وہیں سے گھاس کھانے لگا۔ اس نے انسانوں والا کھانا پینا چھوڑ دیا۔ جن گھاٹوں سے ہرنیاں اور جنگلی جانور پانی پیتے انہی سے وہ پانی پیتا۔ اس کو یہ آثار کی محبت نظر آنے لگی۔ انہی ہرنیوں اور جانوروں میں اس کی وفات ہوئی۔

امام دیلمیؒ نے کتاب ''الالف والمالوف'' میں بیان کیا کہ عبدالملک بن مروان کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں کثیرؔ نامی شاعر تھا۔ کثیرؔ، عبدالملک بن مروان کے دربار میں حاضر تھا تو عبدالملک بن مروان نے کثیرؔ سے کہا کہ کیا تم نے اپنی زندگی میں خود سے بڑا عاشق بھی دیکھا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں ایک عاشق دیکھا ہے۔ عبدالملک بن مروان نے کثیرؔ سے کہا کہ اس کا قصہ سناؤ۔ کثیرؔ سنانے لگا کہ میں ایک روز بہت بھوکا تھا، جنگل کی جانب شکار کی امید سے نکل گیا۔ ایک عاشق ملا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ مست حال تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کوئی شکار مل جائے گا تو اس نے کہا کہ میرے ساتھ چلو، میں بھی شکار کی تلاش میں ہوں اور میں خود تین دن سے بھوکا ہوں۔

اسی اثنا میں مٹیالے رنگ کی ایک ہرنی شکار میں پھنس گئی۔ وہ شخص اس کی طرف دوڑا اور ہرنی کو پکڑ لیا۔ کثیر خوش ہوا کہ شکار ہاتھ آگیا لیکن معاملہ یوں ہوا کہ وہ شخص اپنے کپڑوں سے ہرنی کا کیچڑ صاف کرنے لگا، اسے دیکھنے اور سونگھنے لگا اور اس کے بعد ہرنی کو بھگا دیا۔ کثیر اس کے منہ کو تکتا رہا۔ اس شخص نے صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے دوبارہ جال لگایا۔ دوبارہ ہرنی پھنسی۔ کثیر خوش ہوا کہ اب کام چل جائے مگر اس شخص نے پھر اس ہرنی کے ساتھ وہی معاملہ کیا۔ کثیر کہتا ہے کہ میں نے اس شخص

سے کہا کہ پاگل آدمی یہ کیا کرتے ہو۔اس شخص نے شعر پڑھ کر صبر کی تلقین کی۔آگے بڑھ کر پھر ہرنی ملی۔ میں دوڑا کہ اس بار میں شکار پکڑتا ہوں ورنہ اس شخص نے پھر چھوڑ دینا ہے لیکن وہ شخص مجھ سے پہلے پہنچ گیا اور ہرنی کے ساتھ تیسری بار بھی محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے ہوئے اسے آزاد کر دیا۔

میں نے سوچا کہ اس شخص سے تو کچھ نہیں ملنا تو میں چل دیا لیکن اس نے مجھے آواز دے کر صبر کرنے اور ساتھ چلنے کو کہا۔ تھوڑی دیر آگے چلے تو آگے پورا ریوڑ ہرنیوں کا ملا۔اب مجھے تسلی ہوئی کہ اس بار تو کچھ شکار ہاتھ آئے گا۔وہ شخص آگے بڑھا، ہرنی کو پکڑ کے وہی کچھ کیا جو پہلے تین بار کیا تھا اور اس سارے ریوڑ کو بھگا دیا۔ میں نے اس سے شکوہ کیا کہ کیا کرتے ہو۔اس نے تعجب سے میری طرف دیکھ کر کہا کہ یہ حرم ہے یعنی یہ پناہ گاہ ہے۔اس میں کسی ہرنی یا کسی اور جانور کی جان نہیں لی جاسکتی۔ میں اس پناہ گاہ میں آنے والے ہر جانور کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کیسی پناہ گاہ ہے؟ کثیر نے عبدالملک بن مروان کو بتایا کہ اس شخص نے کہا کہ جب لیلیٰ چھوٹی تھی تو وہ اپنی بکریاں اس صحرا میں چراتی، یہاں بیٹھتی، کھیلتی، کھانا کھاتی تھی تو اس پورے خطے کے جانوروں کی جان کا محافظ میں ہوں۔ عبدالملک بن مروان نے پوچھا کہ اس دیوانے کا نام کیا تھا؟ کثیر نے جواب دیا کہ اس کا نام قیس بن ملوح ہے۔

عشقِ حقیقی کا حرم

قیس کو عشق مجازی تھا کہ اس نے محبوب کو وہاں بیٹھتے اٹھتے، کھانا کھاتے دیکھا۔اس صحرا کو اس کے محبوب سے نسبت تھی کہ وہاں آنے والے ہر جانور کا محافظ بنا پھرتا تھا۔ عشق حقیقی کا دعویٰ کرنے والو! رب العزت نے ہمارے لیے بھی حرم قائم کر رکھے ہیں یعنی حلال و حرام کا سارا تصور ہمارے محبوب کی قائم کردہ حدود ہیں۔اس صحرائے حیات میں کسی کا حق نہیں چھین سکتے، کسی کی غیبت یا چغلی نہیں کر سکتے، کسی کے خلاف بغض و حسد نہیں رکھ سکتے۔کتنے بے وفا ہیں ہم لوگ! ہم نے مجنوں جیسے شخص سے بھی سبق نہ سیکھا۔ہم شب و روز اپنے صحرائے حیات کے حرم میں گناہ کرتے ہیں، محبوب کو ناراض کرتے ہیں، اللہ کی مخلوق سے بغض کرتے ہیں، نفرتیں کرتے ہیں، نفس پرستی کرتے ہیں، لوگوں کی عزتیں اچھالتے ہیں۔ مجنوں سے سبق سیکھیں کہ وہ اپنے نفس اور خواہش نفس کو بھول گیا تھا۔

میرے نوجوان بیٹو! میری زندگی کی ایک خواہش ہے کہ وہ عشقِ مجازی جو مجنوں کو ملا۔ مجنوں جو تھا سو تھا مگر اس سے سبق سیکھو اور اپنے مولیٰ سے عشق کرو۔ ساری مخلوق اس کی ہرنیاں ہیں کسی کی عزت پر زبان نہ کھولو، کسی کے متعلق بدگمانی نہ کرو، زبان درازی نہ کرو، خود کو کسی سے بڑا نہ سمجھو، اپنی طلب کو دوسرے کی طلب سے عزیز نہ جانو، ہر ایک سے محبت کرو کیونکہ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ آقاؐ نے فرمایا:

الخلق عیال اللہ احبھم الی انفعھم۔ (مسند ابو یعلیٰ)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کو اس سے محبت زیادہ ہے جو اس کے کنبے کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے والے بن جاؤ۔ مجنوں سے سیکھو کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ محبت طور اطوار کو بدل دیتی ہے، محبت اخلاق اور زاویہ نگاہ کو بدل دیتی ہے۔ اگر محبت ہو اور طور طریقے نہ بدلیں، اللہ کے حرم کا شرم و حیاء پیدا نہ ہو، سجدوں میں لذت نہ ملے، اللہ کا ذکر کر کے حلاوت نہ ملے تو یہ جھوٹ ہے۔ توڑ ڈالو جھوٹی محبت اور عشقِ مجازی کے برتنوں کو۔ اپنے دل کے برتن کو عشقِ مولیٰ سے بھر لو۔

مجنوں کے عشقِ صادق کا نتیجہ

امام غزالیؒ، امام ابو القاسم القشیریؒ اور دیگر ائمہ بیان کرتے ہیں کہ مجنوں کے عشق صادق کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مجنوں کی وفات ہوئی تو وہ کئی لوگوں کو خواب میں ملا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ مرنے کے بعد اللہ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس نے جواب دیا:

غفرلی وجعلنی حجۃ علی المحبین۔

اللہ نے مجھے معاف کر دیا اور مجھے محبت کرنے والوں کے لیے حجت بنا دیا۔

امام قشیریؒ یہ خواب بیان کر کے توضیح فرماتے ہیں کہ ابو یعقوب السوسیؒ نے فرمایا کہ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی بارگاہ میں اپنا حق بھی بھول جائے۔ نفس، نفسانیت اور نفسیت بھول جانے کے بعد اپنا حق بھی بھولے بغیر محبت اپنے کمال تک نہیں پہنچتی۔ اپنا حق اور حصہ اس قدر بھول جائے کہ دھیان صرف مولیٰ پر رہ جائے۔ جب بندہ صرف اللہ کا طالب ہو جائے تو پھر خود، خودی، نفس اور اپنا حق یاد ہی نہیں رہتا۔

حسین بن منصور حلاجؒ فرماتے ہیں کہ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے ساتھ اس طرح تعلق جوڑ لے کہ عاشق اپنے اوصاف سے باہر نکل آئے۔ اس طرح بندہ صرف ایثار ہی ایثار رہ جاتا ہے۔ محبت سراپا ایثار ہے اس لیے جب اللہ نے مہاجرین وانصار کی تعریف کی تو فرمایا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (الحشر:۹)

”اور اپنی جانوں پر انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اِنہیں شدید حاجت ہی ہو۔“

محبت بے نفسی سکھاتی ہے۔ جسے محبت میں اپنا نفس اور اپنا حق نظر آئے وہ محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ جب حقیقی محبت پیدا ہو جائے تو اللہ کے سوا کسی چیز کی طلب نہیں رہتی۔ امام ابو عبد الرحمن السلمیؒ اپنی کتاب الفتوۃ میں فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اپنی طرف سفر

عشق کرنے والے شخص کو ہر روز ستر مرتبہ دیکھتا ہے۔ ہر بار اللہ رب العزت اپنے اس عاشق کا دل ہر غیر سے پاک دیکھتا ہے تو اسے مزید قربت عطا کر دیتا ہے۔ یوں یکے بعد دیگرے بے نفسی دیکھ کر پردہ اٹھاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ سے عالم رویا میں پوچھا: ماذا ترید؟ کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا:

اللہ انی ارید ان لا ارید الا ما ترید۔

مولا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ صرف وہی کچھ چاہوں جو تو چاہتا ہے۔

اور دوسرا قول ہے: انی ارید ان لا ارید۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں۔

جب چاہت، ارادہ، خواہش، طلب، محبوب کی چاہت، ارادے، خواہش اور طلب میں مر جائے تو پھر اللہ تعالیٰ عشق میں اپنے اس بندے کو بڑھاتا ہے۔

امام غزالیؒ، احیاء علوم الدین کی کتاب المحبۃ میں بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ پر چالیس حوریں آشکار کی گئیں۔ دیر تک مجھے متوجہ کرتی رہیں۔ میں نے ایک نظر اٹھا کر حور العین کو دیکھ لیا۔ پھر چالیس دنوں کے لیے اللہ پاک نے میرے دل پر حجاب ڈال دیئے۔ چالیس دن کے بعد اس سے بھی زیادہ حسن و جمال والی اسی حوریں دکھائی گئیں۔ مجھے کہا گیا کہ ان کو دیکھو یہ کیسی ہیں؟ میں سجدے میں گر گیا اور عرض کیا:

اعوذ بك من ما سواك الا حاجة لی بهذا۔

مجھے ہر اس شے سے پناہ دے دے جو تیرے سوا ہے مجھے ان چیزوں کی حاجت نہیں۔

میں دیر تک روتا اور گڑ گڑاتا رہا جب تک وہ تمام حوریں واپس نہیں چلی گئیں۔ اللہ رب العزت نے پردہ پھر سے اٹھا دیا۔ عشق ذرہ بھر مشارکت گوارا نہیں کرتا تو جو آدمی چوبیس گھنٹے اپنے نفس کو دھیان میں رکھے اسے عشق کیسے نصیب ہو۔

امام عبد اللہ بن جعفرؒ فرماتے ہیں کہ میں سفر کے دوران ایک باغ سے گزار جس میں ایک حبشی غلام بکریاں چرا رہا تھا۔ اتنے میں اس کے مالک نے اسے کھانا بھیجا۔ تھوڑی دیر میں ایک کتا آیا اور اس حبشی جوان کو دیکھنے لگا۔ اس نے ایک روٹی اٹھا کر کتے کو دے دی۔ کتا تیزی سے وہ روٹی کھا کر پھر اس غلام کو کہنے لگا۔ کتے نے وہ روٹی کھالی پھر دیکھنے لگا۔ حبشی غلام نے تیسری روٹی بھی اسے دے دی۔ یوں غلام کے پاس کھانے کو کچھ نہ بچا۔

حضرت عبد اللہ بن جعفرؒ فرماتے ہیں کہ میں اس غلام کے قریب گیا۔ اس کے چہرے پر عشق و محبت اور معرفت کے آثار تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ روزانہ کھانے کو کتنی روٹیاں ملتی ہیں؟ اس نے کہا: تین، میں نے اس سے کہا کہ وہ تینوں روٹیاں تو تم نے کتے کو ڈال دی ہیں، خود کیا کھاؤ گے؟ غلام

نے کہا کہ اگر زندہ رہے تو کل مل جائیں گی روٹیاں اور کھالیں گے۔ حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ میں رو پڑا۔ میں نے کہا کہ ہمارا روحانیت کا مدار ہی بے نفسی اور سخاوت پر ہے مگر اس میں یہ غلام ہم سے بازی لے گیا۔ میں نے وہ باغ اور بکریاں ساری خرید لیں اور غلام کو دے دیں۔ غلام نے شکریہ ادا کر کے سب کچھ ارد گرد غریبوں میں تقسیم کر دیا اور مسکراتا ہوا چل دیا تو میں سمجھا کہ جواں مردی اس کا نام ہے۔ اپنا حق بھول جانا یہ جواں مردی ہے۔ حق لینا جائز ہے مگر اس سے ولایت نہیں ملتی۔

امام ابو سعد النیشا پوریؒ نے تہذیب الاسرار میں بیان کیا کہ کئی اللہ والوں نے بیان کیا کہ ہم طرطوس میں ایک جماعت کے ساتھ مل کر جہاد کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کتا ہمارے ساتھ چل پڑا۔ صحرا میں ٹیلے کے قریب ایک مردار جانور تھا۔ ہم ٹیلے پر تھوڑی دیر آرام کے لیے بیٹھ گئے۔ کتا، مردار کو دیکھ کر اپنے گاؤں کی طرف واپس پلٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد بیس کتوں کو ساتھ لے کر واپس آیا۔ ان بیس کتوں کو مردار پر کھانے کے لیے چھوڑ دیا اور خود ہٹ کر بیٹھ گیا۔ جب سارے کتے سیر ہو کر واپس پلٹ گئے تو وہ کتا آیا اور باقی ماندہ مردار کو کھا کر واپس پلٹ گیا۔ اسی واقعہ کو حضرت داتا گنج بخشؒ نے شیخ احمد حماد سرخسیؒ کا حوالہ دیتے ہوئے سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت نمبر 9 کی ذیل میں بیان کیا اور انھوں نے شیر کا ذکر کیا کہ جب وہ باقی ماندہ کھا چکا تو وہ ہماری طرف یوں دیکھنے لگا گویا کہہ رہا ہو کہ اپنا حق دوسروں پر قربان کر دینا تو ہماری طرح جانور اور کتے بھی کر لیتے ہیں۔ تم مردانِ حق ہو، تمھارا درجہ قربانی میں اس سے کئی گنا بلند ہونا چاہیے۔

میرے بیٹو اور بیٹیو! ساری زندگی کے حالات، زاویہ نگاہ اور دل کو بدلو، نفس، نفسانیت اور نفسیت کو نکالو اور یہ طریق عشق سے نصیب ہوتا ہے۔ اسی لیے مولانا رومؒ نے مثنوی میں فرمایا:

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد
اوز حرص و عیب کلی پاک شد

اگر عشق کی آگ سے نفس کا جامہ چاک کر لیا جائے تو حرص و عیب سے کلیتاً خلاصی نصیب ہوتی ہے۔

حکیم الاُمت کے افکار

حافظہ عائشہ رشید

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پاکستان کی آبادی میں 70 فیصد نوجوان ہیں۔ جو کل آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا طبقہ ہے۔ ملک کی ترقی اور قوم کا مستقبل انہی پر منحصر ہے۔ الحمدللہ ذہانت اور قابلیت کے اعتبار سے پاکستان کا نوجوان کئی قوموں سے آگے ہے۔ اگر ان کی صلاحیتوں کو بروقت بروئے کار لایا جائے اور ان کے لئے ان کے متعلقہ شعبہ جات میں مواقع فراہم ہوں تو یہ نوجوان اپنے ان شعبہ جات میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں۔ ترقی پسند قومیں اپنے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دے کر ان کی مہارتوں کو نکھارتی ہیں۔ ان کی شخصیت سازی کرتی ہیں ان کی اخلاقیات کو سنوار کر انہیں مہذب بناتی ہیں۔ ان کی ذہنی دلچسپی اور صلاحیت کے مطابق ان کے مستقبل کے لئے راہنمائی کرتی ہیں۔ کیونکہ قوموں کا مستقبل انہی نوجوانوں کی بدولت روشن ہوتا ہے۔

دوسرا بڑا چیلنج مذہبی انتہا پسندی ہے۔ بدقسمتی سے سیاسی مفادات کے لئے پاکستان کے اندر رات و رات مذہبی جماعتیں وجود میں آتی ہیں جن کا ایجنڈا انتشار، بدامنی اور محض ہنگامہ آرائی ہوتا ہے۔ ایسی

جماعتوں کا ٹارگٹ وہ ان پڑھ نوجوان ہوتے ہیں جو بڑی آسانی سے کسی جذباتی نعرے کے جھانسے میں آکر اس جماعت کی منفی اور ملک دشمن سرگرمیوں کا حصہ بن جاتے ہیں اور بالآخر انتہا پسندانہ ماحول میں بڑھتے بڑھتے انتہا پسندی کی سوچ کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اور یوں ان کے جذبات کا استعمال کر کے انہیں قتل و غارت گری اور دنگے فسادات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

تیسرا اور سب سے بڑا چیلنج پاکستان کے اندر نام نہاد جمہوریت کے نام پر ہونے والی مکروہ سیاست ہے۔ جس کا شکار سب سے زیادہ ہمارا نوجوان ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے عذاب سے دوچار نوجوان حالات کی تبدیلی کے لئے کبھی ایک جماعت تو کبھی دوسری جماعت کے کھوکھلے نعروں کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں بدقسمتی سے جن کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔

پاکستان کا نوجوان ان حالات میں بری طرح متاثر ہے۔ آج ہمارے نوجوان اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ انہیں یہ وطن اپنا وطن نہیں لگتا اور یہاں رہتے ہوئے اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے ایسے میں وہ پستول اٹھا کر راہزن بننے اور لوگوں کو لوٹنے پہ مجبور ہیں یا غیر قانونی طریقے سے کشتی پر سوار ہو کر دوسرے ملک بھاگنے پر مجبور ہیں اور وہ کشتی یونان کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے اور سینکڑوں نوجوانوں کی شکل میں اس ملک کا مستقبل پانی میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور جاتے جاتے اس ملک میں مروجہ فرسودہ، فاسقانہ، ظالمانہ نظام پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان چھوڑ جاتا ہے۔ اقبال نے زندہ قوموں کا تعارف کرواتے ہوئے نوجوانوں کا ذکر کچھ یوں کیا۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

اقبالؒ کی عہد شباب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت خودی اور خود شناسی ہے۔ نوجوان شاعر نے اپنے ہم عصر نوجوانوں کو نہ صرف اپنی شخصیت و سیرت کی تعمیر کا ایک ہلکا سا منظر دکھایا ہے، بلکہ اس آزاد خیالی، روشن خیالی اور کشادہ دلی کا ایک واضح تصور بھی اُن کے سامنے رکھ دیا ہے، جو اعلیٰ انسانی اقدار کے خلاصے اور جوہر کا دوسرا نام ہے۔

نوجوان اقبال جب اس جوہر طبیعت اور اس انداز تربیت سے آراستہ ہو کر ۱۹۰۵ء میں تکمیل تعلیم کے لیے یورپ گیا تو اُسے مغرب میں اپنی فکر کو جلا دینے اور اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ ان کا ایک حیرت انگیز اثر اُس کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ یورپی ممالک کی جارحانہ وطن پرستی سے بے زار ہو گیا اور عالم اسلام کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدت سے اُس کے ذہن پر چھا گیا اور اُسے یقین کامل ہو گیا کہ :

"ہندی مسلمان بلکہ مسلمانان عالم کی آزادی و ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خالص اسلامی شعائر و اقدار کو زندہ کریں اور مذہب کے رسوم وظواہر سے نہیں بلکہ روح اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اُصول کشید کریں، جن کی صداقت پر خود گردش زمانہ نے بار بار اپنی مہر ثبت کی ہے"۔

چنانچہ یورپ کے قیام کے دوران اقبالؒ کے جن افکار و خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا، وہ اکثر و بیشتر اسی تاثر کے حامل ہیں۔ اقبال نے انہیں ایک منظوم مراسلہ لکھا جو اُن کے مجموعہ کلام "بانگ درا" (صفحہ ۹۷) میں شامل ہے۔ بظاہر یہ مراسلہ ایک دوست کا خط ہے، مگر در حقیقت اس درد پنہاں کا طوفان ہے، جو اُن دنوں شاعر کے دل درد مند میں کروٹیں لے رہا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر

ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط

اشعار بانگ دراص: ۹۷

ہندوستان سے بڑھ کر، اب ملت اسلامیہ کے ایک حساس، نوجوان شاعر کے سینے میں جس قسم کے جذبات تلاطم برپا کر رہے تھے، یہ نظم لطیف اُن کی ہلکی سی آئینہ داری کرتی ہے، لیکن یہاں بھی اقبالؒ نے خودی اور خود شناسی سے صرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور اپنی بے تابیوں میں محض ایک رفیق دور افتادہ کو شریک کیا ہے۔ اپنے ہم عصر نوجوانوں کو اُس نے اب بھی براہ راست کوئی پیغام نہیں دیا، اگرچہ اپنا سینہ چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوت ہم نفسی ضرور نمایاں ہے۔

پھر اقبالؒ کی شاعری کا دوسرا دور آیا، جب اقبالؒ نے پختہ سالی کی منزل میں قدم رکھا اور وہ روایتی حق حاصل کیا، جس کی رُو سے شاعر یا فلسفی اپنے خیالات و جذبات براہ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبالؒ اُس بارے میں بہت وضع دار تھے۔ یہاں بھی اُن کے مخاطبین محض نوجوان تھے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ہر جگہ براہ راست نوجوان کا نام لے کر اُس سے خطاب نہیں کیا۔ اُن کے موضوعات میں سے کوئی موضوع ایسا نہیں، جس کا تعلق نوجوان، جواں مرد، مرد جواں ہمت اور اُس کے عمل و کردار سے نہ ہو۔

اپنی معروف نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" میں اقبالؒ نے ایک منفیانہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہاں جوانان اسلام کی موجودہ زبوں حالی کا تلخ جائزہ لے کر خاموش ہو گئے ہیں۔ ابھی اقبالؒ نے مسلم نوجوان کو صرف نادم و شرمسار کیا ہے۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلے سے نہیں لگایا۔ ابھی اُس کم کردہ منزل کی طرف اشارہ کیا ہے، جسے از سر نو حاصل کرنا اُس کے لیے مقدر ہو چکا تھا، مگر ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ شاید یہ احساس ندامت اقبالؒ کے مخاطب نوجوان کے لیے ایسا ہی ضروری تھا، جیسا اُس کے بعد پیدا ہونے والا جذبہ یقیں۔

اقبالؒ کی شاعری کا تیسرا دور الہامی شاعری کا دور ہے۔ اس دور میں اقبالؒ پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ اُس کے وطن کے نوجوانوں پر عنقریب نیا بتاآنہی کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خصوصاً اُن کی لازوال نظم ''طلوع اسلام'' جس کا نام ہی پیغمبرانہ بشارت رکھتا ہے، اس ضمن میں بہترین مثال ہے۔ یہ نظم ان نظموں کی تمہید کہی جاسکتی ہے جن میں نوجوانوں کو براہ راست مخاطب کیا گیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار بہ طور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اقبالؒ نے اپنے تینوں تخلیقی ادوار میں، پوری شاعری میں تین بنیادی نظریات دیے ہیں، یعنی خودی، فقر اور عشق۔ یہ تین باطنی اوصاف ہیں۔ جس شخص میں یہ تینوں اوصاف بہ درجہ اتم موجود ہوں، وہ اقبالؒ کی زبان میں مومن ہے، اور اس کی تشبیہ شاہین یا شاہباز ہے۔

نوجوان کے مثبت باطنی اوصاف

1. خودی، ایمان، یقین
2. فقر، غیرت
3. عشق، عشقِ قرآن حکیم، عشقِ رسول ﷺ
4. مومن
5. شاہین

ان تمام اعلیٰ، تعمیری اور مثبت اخلاقی اوصاف کے حصول میں عصر حاضر میں تین بڑی رکاوٹیں ہیں، جن کا ذکر اقبال بڑی دردمندی سے کرتے ہیں

نوجوان کے منفی ظاہری اوصاف جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے

1. مذہب سے دوری، کفر والحاد اور لادینیت کا فروغ۔
2. علم سے دوری، جدید تعلیم کے مضر اثرات۔
3. تہذیب سے دوری، مغربی تہذیب کے مضر اثرات۔

ان شعبوں میں نوجوانوں کو منظوم کلاموں مثلاً دختران ملت کے نام، نونہالانِ ملت سے خطاب، پیغام بہ ذریعہ جاوید اقبال اور پیام منشور کے ذریعے عمل و کردار کی تلقین کے ساتھ ساتھ اقبال نے دُخترانِ ملت، اور پھر نونہالان کو بھی اُن کے ذہن و مزاج کے مطابق اپنے پیام خوش کلام سے نوازا ہے۔ نوجوانوں کو اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اس سے منسلک اتحاد عالم اسلامی "کی اہمیت وضرورت کے بارے میں بھی خطاب کیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نوجوانوں کی حالت زار

قیامِ پاکستان کے بعد ریاستِ پاکستان کی 70 سالہ تاریخ گواہ ہے کہ وطن عزیز میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور قائدِ اعظمؒ کی فکر اور فرمودات کی جھلک نظر آنی تو دور کی بات، یہاں تو سب کچھ اس کے بر عکس نظر آیا۔ خواہ تعلیمی نظام ہو یا معاشی نظام، سیاسی حالات ہوں یا اخلاقی و معاشرتی صورتحال ہر شعبہ آزاد خود مختار ریاستِ پاکستان میں زبوں حالی کا شکار ہی ملا۔ لمحہ فکریہ ہے کہ وہ نوجوان طبقہ جو ملک و قوم کا سرمایہ اور کل آبادی کا 60 فیصد ہے ہمارے نام نہاد حکمرانوں کی ترجیح ہی نہیں رہا جبکہ مصورِ پاکستان اور بانی پاکستان کے خطبات اور فرمودات میں جابجا نوجوان نسل کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شدت سے محسوس کیا گیا کہ جناحؒ اور اقبالؒ کے فرمودات کی روشنی میں تعمیر پاکستان سے تکمیلِ پاکستان کے سفر میں نوجوان طبقے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اُسے پھر سے اقبالؒ کا شاہین اور قائدِ اعظمؒ کے پاکستان کا سپاہی بنایا جائے تاکہ لاکھوں قربانیوں کا ثمر پاکستان کو اپنا اصل تشخص واپس دلایا جاسکے۔ پاکستان سے لاقانونیت، اقرباء پروری، بدامنی، بے روزگاری، کرپشن، غنڈہ گردی، تنگ نظری، انتہا پسندی اور دہشتگردی کا خاتمہ ہوسکے۔ وطنِ عزیز کا امن بحال ہو، خوشحالی کا دور دورہ ہو، نوجوان ڈگریاں ہونے کے باوجود بے روزگاری کی وجہ سے نہ تو جرائم میں ملوث ہوں اور نہ ہی خودکشیاں کریں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی اسرار و رموز میں ایک حکایت بیان کی جس میں ایک نوجوان نے سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ سے دشمنوں کا خوف دور کرنے کے لیے راہنمائی طلب کی تو انہوں نے فرمایا اے راز حیات سے ناواقف نوجوان تو زندگی کے آغاز اور انجام سے غافل ہے تو دشمنوں کا خوف دل سے نکال دے تیرے اندر ایک قوت خوابیدہ موجود ہے اس کو بیدار کر۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی اردو شاعری میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

علامہ اقبالؒ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں:

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے

فلسفہ خودی

جس نوجوان کا ذکر اقبال نے کیا اس کی شخصیت کی بنیاد خودی پر رکھی۔ اقبالؒ نے قوموں کی ترقی کو تلوار کی بجائے کردار سے جوڑا۔ اور اس کردار کی بنیاد اور اساس خودی کو قرار دیا۔ آپؒ نے نوجوان نسل پر اعتماد کرتے ہوئے فرمایا:

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

علامہ اقبالؒ نے نوجوانوں کو خودی کا پیغام دیا اور فرمایا کہ نوجوان خود شناسی سے خدا شناسی کا سفر طے کریں، اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں اور بڑے قومی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو دوسروں پر غالب کرنے کی کوشش کریں اور اپنے سماج سے ہر قسم کی برائی کو ختم کر کے ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کریں جس میں امن، سلامتی، برداشت، رواداری اخوت، سخاوت اور محبت جیسی خوبیاں موجود ہوں۔ علامہ اقبالؒ چاہتے تھے کہ نوجوانوں کے خیالات بلند ہوں، انسان کامل اور مرد مومن بننے کی خواہش ان کے دل کے اندر موجود ہو، علامہ اقبال نے فرمایا:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اگر ہم نے واقعی اقبال کی فکر کو کسی حقیقت میں بدلنا ہے تو ہمیں کسی ادارے، کسی حکومتی سرپرستی اور حکومتی اقدام کا انتظار کیے بغیر اپنی نسلِ نو کے اندر ایک منظم (Systematic) طریقے سے وہ شعور اور احساس پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے اسے اپنے منصب سے آگہی ہو، وہ اپنی عظمت اور زندگی کی مقصدیت سے آشنا ہو اور اس مقصد کے لیے جینا شروع کرے۔ جب اسے مقصد کا شعور ملے گا تو

راستہ کی طلب اور پیاس بھی پیدا ہو جائے گی اور جب پیاس پیدا ہو تو پھر اس پیاس کا حل بھی نکل آتا ہے۔ لیکن اگر اس کے بغیر ہم کوئی فکری غذا دینے کی کوشش کریں گے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کا جزوِ بدن نہیں بنے گی۔

فلسفہ تعلیم

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی فکر، شاعری اور آپ کی نثر اتنی جامع ہے کہ اس کے اندر ہمیں نہ صرف نوجوان نسل کی مجموعی تربیت بلکہ نوجوان نسل کے لیے تعلیمی نظام کو سدھارنے اور تعلیمی نظام کو بہتر کرنے کے سارے پہلوؤں کا احاطہ ملتا ہے۔ علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ مروّجہ تعلیمی نظام کی خرابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر
لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامانِ سفر
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانۂ موجود ہو
غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

علامہؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اب بتایا جا رہا ہے کہ تعلیم حاصل کرو تمام ملی مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور اجتماعی امراض بھی دور ہو جائیں گے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس تعلیم کی مجھے بات بتائی جا رہی ہے، وہ تعلیم معبودِ حاضر کی پوجا کی بات کرتی ہے اور جو معبودِ غائب یعنی ذاتِ حق ہے اور جو نظام مبنی بر وحی ہے، مجھے اس سے دور کرتی اور محسوسات میں قید کرتی ہے۔ اقبالؒ علمِ نظری کے قائل نہیں بلکہ علمِ عملی کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو انسان کو حرکت، عمل، جدوجہد اور تخلیق کی طرف لے جائے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

علم کا اصل فائدہ تب ہے جب وہ انسان کے کردار اور عمل میں جھلکے۔ اقبالؒ محض کتابی علم کو ناکافی

سمجھتے ہیں؛ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم انسان کے اندر حرکت، عمل اور ذمہ داری پیدا کرے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ شعر نوجوانوں کو پیغام دیتا ہے کہ تعلیم صرف ڈگری نہیں بلکہ دنیا کی قیادت کے لیے تیاری کا عمل ہے۔ جب مسلمان نوجوان علم، عدل، اور شجاعت کے اسباق پر مبنی تعلیم حاصل کرے گا تو وہ امت کی قیادت کرے گا۔

علامہ اقبالؒ کی آرزو تھی کہ مسلمان نوجوان شاہین بنیں کیونکہ شاہین ایک ایسا پرندہ ہے جو خود دار اور غیرت مند ہے دوسروں کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، اپنا آشیانہ نہیں بناتا، خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے۔ علامہ اقبالؒ چاہتے تھے کہ یہی خصوصیات نوجوانوں میں پیدا ہو جائیں تو وہ ایک مثالی قوم کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام جاوید نامہ میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، تیری ماں نے تجھے لاالٰہ کا پہلا سبق دیا تھا، تیری کلی اس کی باد نسیم سے کھلی لاالٰہ کہتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے کہہ تاکہ تیرے بدن سے بھی روح کی خوشبو آئے۔ افسوس اس دور کے مسلمان نے معمولی قیمت پر دین و ملت کو بیچ دیا۔ اس نے اپنا گھر بھی جلا دیا اور گھر کا سامان بھی، کبھی اس کی نماز میں لاالٰہ کا رنگ تھا مگر اب نہیں کبھی اس کی نیاز مندی میں ناز تھا مگر اب نہیں۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتا تھا، آج کل مال کی محبت میں مبتلا ہے۔ نماز اور روزے کی روح جاتی رہی ہے تو فرد بے لگام ہو گیا ہے اور سینے حرارت قرآن پاک سے خالی ہو گئے، ایسے لوگوں سے بھلائی کی کیا امید ہے۔ ہمارے نوجوان پیاسے ہیں مگر ان کے جام خالی ہیں، چہرے چمکدار، دماغ روشن مگر اندرون تاریک کم نگاہ، بے یقین اور مایوس ان کو دنیا میں

کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ غصے میں ہو یا خوشنودی میں عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور افلاس ہو یا امارت میانہ روی کو نہ چھوڑ اور اعتدال پر قائم رہ۔ پاکستان کے نوجوان موجودہ دور کے موقع پرست مفاد پرست لیڈروں کے فریب میں آنے کی بجائے علامہ اقبالؒ کے پیغام کی جانب رجوع کریں اور علامہ اقبالؒ کی فکر و دانش سے مسلح ہو کر موجودہ حالات کا مقابلہ کریں اور پاکستان کو لاحق سنگین بحرانوں سے باہر نکالیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں فرمایا تھا۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

خلاصۂ کلام

اکیسویں صدی میں ہم نے اپنی نوجوان نسل کی علمی و فکری اور نظریاتی تربیت کس طرح کرنی ہے؟ اس حوالے سے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی فکر اور سوچ بہت اہم ہے اور اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ اس قوم کی تعمیر کا راستہ صرف اقبالؒ ہی کا راستہ ہے۔ ہمارے پاس تعمیرِ زندگی، حالات کو سمجھنے اور بطورِ تہذیب اپنے آپ کو آگے لے کر چلنے کی فکرِ اقبالؒ کے علاوہ کوئی ایسی سبیل موجود نہیں ہے جہاں ہمیں ہمارے سوالات کا جواب ملتا ہو اور مسائل کا ایک قابلِ فہم حل میسر آسکے۔ یہ کہنا بے جا اور مبالغہ نہیں ہو گا کہ اگر ہم اقبالؒ کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تہذیبی، سیاسی اور ملی طور پر آج سے ڈیڑھ، دو سو سال پیچھے رہ کر سوچ رہے ہیں۔ اگر ہم اقبالؒ کو ردّ کر کے مستقبل میں قدم رکھتے ہیں تو ہم بہت ہی فکری پسماندگی کے ساتھ قدم رکھ رہے ہوں گے۔ اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ آنے والے دور یعنی مستقبل میں ہمارا کوئی بامعنی و بامقصد کردار ہو تو ہمیں نسلِ نو کی تربیت کے ذریعے نسلِ نو کے شعور میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنی ہے۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ ہم نے انہیں مقصدیت سے آشنا کرنا ہے اور انہیں ان کے منصب کا احساس دلانا ہے اور اس آشنائی کا ایک عظیم محرک علامہ اقبالؒ کے افکار و نظریات، آپؒ کی شاعری اور اس شاعری سے ملنے والے اسباق سے کماحقہ آشنا ہونا ہے۔

مثنوی مولائے روم اور تلاشِ راہِ حق

خدیجہ خان

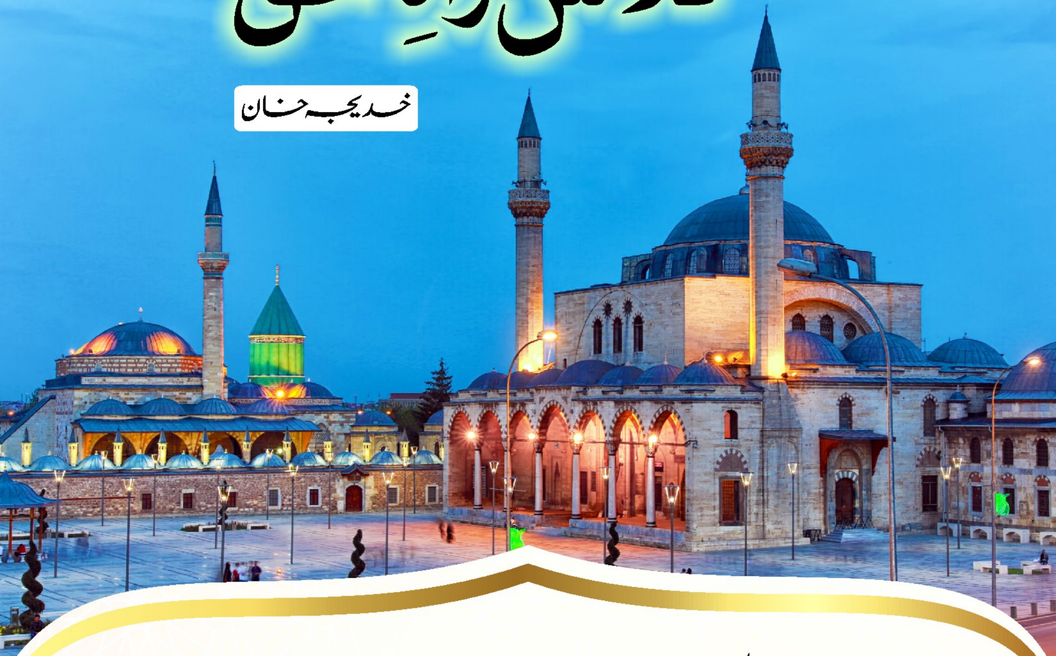

مولانا جلال الدین بلخی رومیؒ، مثنوی معنوی کے مصنف، صوفیائے کرام میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مثنوی معنوی فارسی ادب کا عظیم شہرہ ہے جو رومی کے نام کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے اور اس کی مقبولیت نے فارس کے دیگر شعری مجموعوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کی رپورٹ کے مطابق رومی مغربی دنیا میں آج بھی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے صوفی شاعر ہیں۔

مثنویِ معنوی چھ جلدوں پر مشتمل ہے اور تقریباً ۲۵۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے، اور اسے عموماً فارسی میں قرآنِ فارسی کا درجہ دیا گیا ہے۔ رومیؒ کے نزدیک عشق محض احساس نہیں، بلکہ ایک ایسی باطنی قوت ہے جو بندے کو محدود کائنات سے نکال کر لامحدود حقیقت سے جوڑ دیتی ہے۔ ان کے ہاں عقل راہ دکھاتی ہے، مگر منزل تک پہنچانے والی قوت عشق ہے۔ یہی عشق، تلاشِ راہِ محبوب کی اساس اور تصوف کی روح ہے۔ یوں مثنویِ رومیؒ بندگی، عشق اور عرفانِ ذات کا ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنے رب کے جلوے کو محسوس کرتا ہے۔ یہ کتاب دراصل اس ابدی سفر کی تعبیر ہے جس کا انجام وصالِ محبوب اور اطمینانِ قلب ہے۔

تلاشِ راہِ محبوب کے مراحل

محبوب حقیقی کی تلاش میں رومیؒ نے کئی مراحل بیان کیے ہیں جن میں ہر مرحلہ ایک اعلیٰ روحانی منزل کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثنوی کے مختلف ابواب میں رومیؒ نے ان مراحل کو شاعری کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔

صحبتِ شیخ

رومی شیخ کامل کی صحبت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ مولانا رومؒ کے مطابق ایک قابل رہبر کی صحبت سلوک کا بنیادی جزو ہے۔ شیخ کامل قلبِ سالک کو روشنی عطا کرتا ہے اور پیچیدہ روحانی رموز سے روشناس کراتا ہے مولانا خود اپنی روحانی ترقی میں شمس تبریز سے استفادہ کرتے رہے۔ مثنوی میں کئی حکایات میں شمس تبریز کے مقام اور بزرگی کا تذکرہ ملتا ہے جو شیخ کی صحبت کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ شمس تبریزیؒ کا فیضان نظر ہے کہ رومی نے روحانی رموز و اسرار کی بنا پر دنیا میں شہرت دوام حاصل کیا۔ ایک انسان ضرور حیران ہوگا کہ آیا کہ رومیؒ نے شمس تبریزیؒ کے لیے شہرت دوام کا افق تلاش کیا یا شمس تبریزیؒ، رومیؒ کو ایک غیر مرئی دیدۂ جہاں میں لے گئے۔ کون کس کو حقائق کی اصل حقیقت میں لے گیا اور عشق اور راحت کی بلندیوں پر لے گیا۔ کس نے کس کو حقیقت کی تلاش میں محبوب حقیقی کی طرف راہنمائی کی۔ ان سوالات کے جوابات دینا انسان کے علم و شعور سے بالا ہیں کم از کم کوئی صاحب ذوق صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ اس متبرک وقت کے دوران دو روشن دماغ اور بیدار روحیں، دو سمندروں کی مانند اکٹھی ہوئیں اور ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں۔ مثنوی میں بیان ہوا کہ

پیر را بگزین کہ بے پیر ایں سفر
ہست بس پر آفت و خوف و خطر

مرشد کامل کی تلاش کرو کیونکہ بغیر رہنما کے یہ سفر بہت سی آفات، خوف اور خطر سے بھرا ہوا ہے۔

یہاں پیر سے مراد مرشد کامل ہے۔ رومیؒ کا کہنا ہے کہ کسی رہنما کا نہ ہونا انسان کو غلط راستوں پر لے جاتا ہے، اس لیے شیخِ کامل کی رہبری باعثِ نجات ہے۔ مولانا رومؒ کے نزدیک شیخ کی صحبت محبوبِ حقیقی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ کیونکہ صحبت انسان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتی ہے

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا

مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَالسُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَنَافِخِ الْكِيْرِ، فَحَامِلُ الْمِسْكِ: إِمَّا أَنْ

يُحْذِيَكَ، وَإِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ، وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيحًا طَيِّبَةً. وَنَافِخُ الْكِيرِ: إِمَّا أَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ، وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ رِيحًا خَبِيثَةً۔

(صحیح بخاری کتاب الذبائح والصید)

"اچھے اور برے ساتھی کی مثال مشک والے (عطار) اور بھٹی دھونکنے والے (لوہار) جیسی ہے کیونکہ مشک والا یا تو تحفتاً تمہیں (تھوڑی بہت خوشبو) دے دے گا یا تم اس سے خرید لو گے، ورنہ عمدہ خوشبو تو تم پا ہی لو گے (یوں تم انبساط خاطر اور انشراح طبع محسوس کرو گے)۔ رہی بھٹی والے (لوہار) کی بات تو اس کی بھٹی کی آگ یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گی وگرنہ تمہیں (بھٹی کی) بدبو تو ضرور پہنچے گی (یعنی بھٹی کا دھواں تمہاری طبیعت کو مکدر کر دے گا۔)"

رومیؒ نے ایک اور جگہ فرمایا:

بے مراداں را مراد آید زپیر

زانک پیر است آشنا باروح سیر

"جو لوگ مقصد کی تلاش میں ہیں مگر راستہ نہیں جانتے، انہیں ایک مرشد ضرورت ہے۔ مرشد وہ ہے جو روحانی سفر کی لطائف جانتا ہے۔"

اس کے تجربے کی روشنی میں مشکلات آسان ہوتی ہیں۔ صحبتِ شیخ انسان کو اس پہلے مقام سے اٹھاتی ہے جہاں وہ خود کو گم محسوس کرتا ہے اور اسے نور دکھاتی ہے۔ اور فرمایا:

یک زمانہ صحبت با اولیا

بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

اللہ کے ولی کی صحبت کے چند لمحے سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہیں۔

عشقِ حقیقی

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ۔ (المائدہ: 54) جن سے وہ (خود) محبت فرماتا ہو گا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔

عشقِ حقیقی انسان کو خودی کی قید سے نکال کر فنا فی اللہ کی راہ پر ڈالتا ہے۔ رومی اسی سفر کو "سفرِ روحانی" کے استعارے میں بیان کرتے ہیں وہ سفر جو "نے" کی صدا سے شروع ہوتا ہے اور "وصلِ

محبوب'' پر ختم ہوتا ہے۔

جیسا کہ مثنوی کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

یہ صدا دراصل روح کی پکار ہے جو اپنے اصل مقام سے جدائی کے درد میں مبتلا ہے۔ یہی دردِ جدائی روح کو تلاش کی طرف لے جاتا ہے، اور یہی تلاش عشقِ حقیقی کا پہلا زینہ ہے۔

رومیؒ کا نظریۂ عشق وحدت الوجود کے تصوفی فلسفے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ابنِ عربیؒ کے مطابق، کائنات میں موجود ہر شے مظہرِ واحدِ مطلق ہے۔ وجودِ حقیقی صرف ایک ہے، باقی سب اس کے ظہور کی صورتیں ہیں۔ رومیؒ اسی تصور کو شعری و عرفانی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں کہ عاشق اور معشوق جدا نہیں ہیں یہ جدائی دراصل شعور کی سطح پر ہے، حقیقت میں سب کچھ ایک ہی نور کا ظہور ہے۔ ان کے نزدیک عشق وہ قوت ہے جو اس ظاہری دوئی کو ختم کر کے وحدت کے ادراک تک لے جاتی ہے۔ چنانچہ ''تلاشِ راہِ محبوب'' دراصل انسان کی اندرونی بیداری اور معرفتِ ذات کا سفر ہے۔

صوفیانہ فکر میں یہ سفر چار مراحل پر مشتمل سمجھا جاتا ہے۔ شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت۔ رومیؒ ان منازل کو مثنوی کی تمثیلی کہانیوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ ہر کردار، ہر واقعہ دراصل سالک کے باطنی حالات کی تصویر ہے۔ ان کے ہاں تاجر و طوطی، شمع و پروانہ، مجنوں و لیلیٰ، سب رموزِ روحانی ہیں جو انسان کو ظاہری عشق سے اٹھا کر عشقِ حقیقی تک لے جاتے ہیں۔ اور عشق کے بارے میں فرماتے ہیں:

عشق آں شعلہ است کہ آتش

در نہاد در بسوزد غیر را و پاک باد

گر ترا زخم است، آں مرھم نگر

زانک آں زخم است از آں یارِ نگر

عشق ایک ایسا شعلہ ہے جو دل میں لگ جائے تو غیرِ محبوب کو جلا دے یعنی انسان کی وابستگی مٹ جائے اور دل صرف محبوب کے لیے ہو جائے۔ دوسرا مصرع اس محبت کے سفر کی حقیقت کو بیان کرتا ہے: محبت کے راستے میں زخم، تکلیف، فراق آتے ہیں۔ مگر وہ زخم بھی ایک مرہم ہے، کیونکہ وہ محبوب کی عطا ہے، امتحان ہے جو انسان کو پاک بناتا ہے۔ یہ عشق وہ قوت ہے جو انسان کو اس کی رفاقت سے آزاد کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب لے جاتی ہے۔ عشق کی روشنی میں دل روشن ہوتا ہے، اور وہ جنہیں عشق نہ ہو، وہ اندھیروں میں رہ جاتے ہیں۔ رومیؒ مزید فرماتے ہیں:

عشق ربّانی ست خورشیدِ کمال

امر نور اوست خلقاں چوں ظلال

عشق کی راہ ایسی ہے کہ اس میں عمل اور علم دونوں کی راہیں جذب ہو جاتی ہیں، عمل کی راہ پر انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، قدم قدم پر چیلنجز کا سامنہ ہوتا ہے۔ علم کی راہ زندگی کو سمجھاتے اور بہت سی گتھیاں سلجھاتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ عشق کی راہ میں یہ دونوں راہیں جذب ہو جاتی ہیں، عشق کی راہ ایسی ہے جو انسان کو گم کر دیتی ہے۔ عشق کی راہ پر انسان کی خودی نظر نہیں آتی، انسان کا عمل خالقِ کائنات کا عمل بن جاتا ہے۔ خدا ہی نئی تراش خراش کرتا ہے وہ تراش خراش کے بعد انسان کو بانسری کی صورت دے دیتا ہے۔ ایک صوفی اُس کلی کی مانند ہوتا ہے جو صبح سویرے سورج کی کرنوں کو اجازت دیتی ہے کہ انھیں کھول دے، اپنی پنکھڑیوں کو کھول دینے کی اجازت دیتی ہے خود نہیں کھلتی۔ سورج کی شعاعیں اس کی خوبصورت نازک پنکھڑیوں کو کھولتی ہیں، بڑی خاموشی سے آہستہ آہستہ، جیسے جیسے کرنیں پڑتی ہیں پنکھڑیاں کھلتی جاتی ہیں، کلی تو عشق کے جذبے سے سرشار صرف اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ سورج کی کرنیں اس کی پنکھڑیوں کو کھول دیں، وہ خود کچھ بھی نہیں کرتی۔ صوفی جب کلی کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو وہ بھی خاموش رہتا ہے۔ وہ دشوار راہوں سے گزر چکا ہے، عمل کی راہ سے گزر چکا ہے، علم کی راہِ سے گزر چکا ہے، دیکھ چکا ہے کہ اب وہ جس راہ پر ہے وہ عشق کی راہ ہے کہ جہاں اس کی خودی گم ہو چکی ہے اور جہاں عمل اور علم کی راہیں جذب ہو گئی ہیں۔ صوفی پھر سورج مکھی کے

پھول کی طرح گھومتا ہے۔ جس جانب آفتاب ہوتا ہے اس کا رُخ بھی اسی طرف ہوتا ہے، عشقِ الٰہی کی شعاعیں اس کی شخصیت تبدیل کر دیتی ہیں۔

اطاعت الٰہی

اطاعت، عشق کا عملی اظہار ہے۔اسی سے محبوب کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں

بندگی کن تا کہ سلطانی کنی
زیرِ پائی خود جہانی کنی

بندگی اختیار کر، تاکہ بادشاہ بن جائے، اور دنیا تیرے قدموں کے نیچے ہو۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ جو بندہ خدا کے حکم کے سامنے جھک جائے، وہی دراصل آزاد ہوتا ہے۔

خاکِ آدم چونکہ شد چالاکِ حق
پیشِ خاکش سر نہد املاکِ حق

اَ لسّماءُ انشقّت آخر از چہ بود
از یکے چشمے کہ خاکے بر کشود

خاک از دردی نشنید زیرِ آب
خاک بیں کز عرش بگذشت از شتاب

آں لطافت پس بداں کز آبِ نیست
جز عطائے مبدعِ وہّاب نیست

اگر ایک مٹھی مٹی اللہ کی اطاعت کرے تو اس مٹّی کے سامنے آسمان جھک جائیں، خاکِ آدم کی مثال سامنے ہے۔ اس مٹّی کے آگے اللہ کی مملوک نے سر رکھ دیا، آسمان پھٹ گیا (شق القمر) اس کا سبب یہی تھا کہ مٹّی نے آنکھ کھولی تھی، مٹّی تلچھٹ ہو جانے کے سبب پانی کے نیچے بیٹھ جاتی ہے، غور کرو یہی مٹّی تیزی سے عرش سے بھی اوپر چلی گئی، یہ لطافت آب و گل کی نہیں ہے یہ تو اللہ کی دین ہے، عطا کرنے والے نے یہ توانائی عطا کی ہے۔

جب مٹّی اللہ کی اطاعت میں سر رکھتی ہے، تو اس کی عاجزی میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ عرش بھی اس کے سامنے جھک جائے۔ زمین کی مٹی جب نافرمان بن جائے تو پانی کے نیچے بیٹھ جاتی ہے، مگر

یہی مٹی جب اطاعت سے لطیف ہو جائے تو آسمان سے اوپر چلی جاتی ہے۔۔اطاعت وہ توانائی ہے جو مٹی کو خاک سے نور بنا دیتی ہے۔

علم اور معرفت الٰہی

مولانا رُومیؒ نے مادّی زندگی کی حقیقتوں اور وجود کے رُوحانی پہلو کو سمجھنے کے لیے علم کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ علم کے بغیر زندگی کا عرفان حاصل نہیں ہو سکتا، ذہنی اور رُوحانی سکون حاصل نہیں ہو سکتا، بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی، حقائق کو دیکھنے اور پہچاننے کے لیے 'وژن' میں کشادگی نہیں آسکتی، زندگی کے تعلق سے نئی دریافتوں کی لذّت نہیں مل سکتی، وہ ذہنی اور قلبی سکون حاصل نہ ہو گا جس سے رُوحانی انبساط حاصل ہو۔

مولانا رُومیؒ نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے دل میں ایک نہ دِکھائی دینے والا دبستان ہے جو پُراسرار علوم کی وجہ سے خود پُراسرار بن گیا ہے۔ یہاں مطالعہ کے لیے اُس نگہ، کی ضرورت ہے جو آنکھوں کے اندر رہتی ہے۔ زندگی کی سچائیوں سے جو سچی بصیرت حاصل ہو گی اسی سے یہ 'وژن' پیدا ہو گا اور یہ نگہ، متحرّک ہو گی۔ باطن کا علم حاصل کرنے والا عارف ہوتا ہے۔ جب وہ ظاہر اور باطن کے اسرار سے آگاہ ہو جاتا ہے تو دل کے ذریعے معارف کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اُسے زندگی کا مخمور کر دینے والا انبساط حاصل ہوتا ہے۔ کائنات اور اس کے اسرار کے جلال و جمال کے جلوؤں کا سچّا عرفان حاصل کر لیتا ہے، وہ دل جو بہت سے آفتابوں کا مشرق ہے، عارف کے لیے فتّحت ابوابہا کا تجربہ بن جاتا ہے۔

آں دلے کہ مطلعِ مہتاب ا ست
بہر عارف فتحت ابواب ا ست
جوہرِ آہن بکف موے شود

''علم سے رُوح کا نور حاصل ہوتا ہے، لوہے کا جوہر ہاتھ میں موم بن جاتا ہے۔''

جس طرح آگ ابراہیمؑ کے لیے نسرین بن جاتی ہے (نار ابراہیمؑ را نسریں شود) اسی طرح علم مادّی اور رُوحانی زندگی کو پاکیزگی عطا کرتا ہے، آتش کو گلستاں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وجدانی علم سے پُراسرار محبتوں اور رِشتوں کے تئیں ایک دلکش خواب آلود بیداری پیدا ہوتی ہے۔ انتہائی خوبصورت بیداری کہ جس سے بعض پُراسرار معنی خیز ذرّوں کی چمک دمک تھوڑی بہت سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ اس سچائی کو واضح کرنے کے لیے مولانا رُومیؒ نے ایک عمدہ تمثیل پیش کی ہے جس سے تصوّف کی جمالیات کی معنی خیز سطح واضح ہوتی ہے۔ مولاناؒ ایک خوبصورت تمثیل کے ساتھ ذہن کو علومِ معرفت کی جانب لے جاتے ہیں۔

ایک نحوی کشتی میں سوار ہوا، اس خود پرست نے ملاّح سے مخاطب ہو کر دریافت کیا تو نے کچھ نحو پڑھی ہے، ملاّح نے کہا نہیں۔ اُس متکبر نحوی نے کہا تیری آدھی عمر فنا ہو گئی۔ کشتی بان دل شکستہ ہو گیا، لیکن اُس وقت خاموش رہا، کوئی جواب نہیں دیا۔ ہوا یہ کہ کشتی ہوا کی وجہ سے بھنور میں چکرانے لگی۔ کشتی باں نے بلند آواز سے پوچھا ''تو کچھ تیرنا جانتا ہے؟'' نحوی نے جواب دیا تو مجھ سے تیراکی کی اُمید نہ کر۔ کشتی بان نے کہا ''اے نحوی! تیری ساری عمر برباد ہے اس لیے کہ کشتی اس بھنور میں ڈُوب رہی ہے۔''

لہذا معلوم ہوا کہ انسان جتنا بھی علم حاصل کر لے علم کبھی مکمل نہیں ہوتا، تھوڑا سا علم حاصل کر کے تکبر کرنا غلط ہے۔ علم حاصل کر کے انسان کو خود پرست نہیں ہونا چاہیے۔ نحوی اور کشتی بان کی یہ تمثیل پیش کرنے کے بعد مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

مرد نحوی را ازاں در دوختیم

تا شمارا نحوِ محو آموختیم

''یعنی نحوی کا قصہ اس لیے منسلک کر دیا ہے کہ تمھیں فنا کا طریقہ سکھادیں۔''

مولانا رومیؒ نے باطن کی توانائی اور وجود کی خوشبو کا احساس طرح طرح سے دیا ہے۔ کہتے ہیں جس طرح ہرن کے بچےؒ کو کچھ دیر ماں کے قدموں کی ضرورت ہے اس کے بعد خود اس کا نافہ اس کا رہنما بن جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے وجود کی خوشبو کو جان لیتا ہے اور یہ خوشبو اس کی رہنما بن جاتی ہے۔

چند گاہش گامِ آہو در خورست
بعد ازاں خود نافِ آہو رہبرست

اپنے وجدان اور اپنے 'وژن' پر اعتماد ضروری ہے، باطن کی توانائی اور وجود کی خوشبو غیر معمولی نعمت ہے، نافہ کی خوشبو پر ایک منزل چلنا چکر کی سینکڑوں منزلوں سے بہتر ہے۔

رفتنِ یک منزلے بر بوئے ناف
بہتر از صد منزلِ گام و طواف

وجود کی خوشبو اللہ سے قریب کرتی ہے، یہ خوشبو اور خوشبو کا پراسرار رشتہ ہے، خوشبو جو دل میں ہوتی ہے، معبودِ حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔ اس سے معارف کے دروازے کھلتے ہیں، جو عارف ہوتے ہیں اُن کے لیے یہ دل دیوار نہیں دروازہ ہے، پتھر نہیں موتی ہے۔ ہم سب جو کچھ آئینے میں دیکھتے ہیں ایک عارف لوہے کے ٹکڑے میں اس سے قبل دیکھ لیتا ہے۔

اختتامیہ

مولانا رومؒ کی مثنوی دراصل تلاشِ راہِ محبوب کا سفر ہے، وہ سفر جس میں انسان اپنے ظاہر سے باطن کی طرف، اور ''میں'' سے ''وہ'' کی طرف بڑھتا ہے۔ رومیؒ بتاتے ہیں کہ صحبتِ صالحین وہ پہلا زینہ ہے جو دل کو نور عطا کرتی ہے۔ پھر انسان جب عشقِ حقیقی کے سمندر میں اترتا ہے تو اپنی ذات سے نکل کر فنا کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ یہ عشق اسے سکھاتا ہے کہ محبوبِ حقیقی کی راہ میں اپنی خواہش، غرور اور وجود سب قربان کرنے پڑتے ہیں۔ اسی عشق کی راہ میں اطاعتِ الٰہی سب سے بڑا مقام رکھتی ہے۔ جب ایک مٹھی مٹی اللہ کے حکم کے آگے جھک جاتی ہے تو آسمان اس کے سامنے جھک جاتے ہیں،۔ پھر علم آتا ہے، جو اگر غرور سے پاک ہو تو معرفتِ الٰہی تک لے جاتا ہے۔ علم جب عاجزی میں ڈھل جائے تو دل میں وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جو انسان کو اللہ کے قریب کر دیتی ہے۔

بچوں کی پرورش اور والدین کی ذمہ داری

ماہ رخ رانا

ہر گھر کی رونق، ہر والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہر خاندان کی خوشیوں کا مرکز، معصوم بچوں کا وجود محض ایک اتفاق یا معمول کی بات نہیں ہیں۔ بلکہ یہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ایک انمول عطیہ، ایک پاکیزہ امانت اور ایک ایسی نعمت ہیں جس کا کوئی بدل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں رحمت سے ہمیں یہ قیمتی خزانہ ہماری اصلاح، ہمارے امتحان اور ہماری ابدی کامیابی کے لیے سونپا ہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ، یہ معصوم مسکراہٹیں، اور یہ پاکیزہ دل در حقیقت ایک ایسی زمین ہیں جہاں ہم پاکیزہ اخلاق، حقیقی محبت اور درست عقیدے کے بیج بو سکتے ہیں۔ یہ سفید ورق کی مانند ہیں جن پر ہمارے رویوں، ہمارے الفاظ اور ہمارے اعمال کی تحریر رقم ہوتی ہے۔ یہ ننھے پودے ہیں جنہیں ہماری شفقت کی دھوپ، ہمارے صبر کی ہوا اور ہماری رہنمائی کی آبپاشی درکار ہے۔ یہ امانت اس لیے ہے کہ ہم اسے سنواریں، اس کی حفاظت کریں اور اسے اس کے حقیقی مالک کو راضی کرنے کے لیے تیار کریں۔

ہمارا فرض صرف انہیں کھلانا پلانا اور اچھے کپڑے پہنانا ہی نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں محبت، ان کے دماغوں میں علم اور ان کی روحوں میں خوفِ خداوندی پیدا کرنا ہے۔ یہ وہ مقدس فریضہ ہے جس کی انجام دہی پر ہم سے قیامت کے دن ضرور باز پرس ہو گی۔ آیئے، اس عظیم امانت کی قدر کریں اور

اپنے رب کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم اس کی پرورش میں اپنی پوری کوشش، محبت اور دیانت داری کو بروئے کار لائیں۔ آج کے اس مضمون میں ہم بچپن کے انہی سنہری سالوں کے مختلف پہلوؤں، والدین کے رویے کے اثرات، اور ایک صحت مند شخصیت کی تعمیر کے لیے عملی تجاویز پر روشنی ڈالیں گے۔

بچے کی زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس کی پوری شخصیت کی بنیاد رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کسی عظیم عمارت کی تعمیر کے لیے مضبوط بنیاد ضروری ہوتی ہے۔ یہ وہ سنہری موقع ہوتا ہے جب بچے کا دماغ تیزی سے نشو نما پا رہا ہوتا ہے اور وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے تحاشا سیکھ رہا ہوتا ہے۔ جدید سائنس نے ثابت کیا ہے کہ زندگی کے یہ ابتدائی سال ہی دراصل بچے کے دماغ کے "وائرنگ" کا دور ہوتے ہیں، جہاں ہر بات، ہر رویہ، ہر تجربہ اس کے مستقبل کی راہ متعین کرتا ہے۔

یہ وہ دور ہے جب بچے کے اندر اچھے اخلاق، ہمدردی، ایمانداری اور صبر جیسے اوصاف بھی بوئے جاتے ہیں۔ اگر ہم خود گھر میں نرم گفتاری اور احترام کا مظاہرہ کریں گے تو بچہ وہی سیکھے گا۔ اگر ہم اس کے جذبات کو سمجھیں گے اور اس کی بات کو توجہ سے سنیں گے تو وہ خود بھی دوسروں کا احترام کرنا سیکھے گا۔ ابتدائی سالوں میں ڈالی گئی یہی بنیاد اسے مستقبل میں ایک کامیاب اور بااخلاق انسان بنائے گی۔

رحم مادر سے پیدائش تک

حقیقت یہ ہے کہ بچے کی تربیت کا سفر ماں کے پیٹ ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے دین اسلام نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ماں کی حالت، اس کے جذبات، اس کی خوراک اور اس کے افکار کا براہ راست اثر بچے پر پڑتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں اگرچہ حاملہ خواتین کی دیکھ بھال کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن اکثر یہ دیکھ بھال صرف جسمانی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، جبکہ ماں کے جذباتی اور روحانی صحت پر بھی اتنی ہی توجہ درکار ہوتی ہے۔

جدید سائنسی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ بچہ ماں کے رحم میں ہی بیرونی دنیا کے اثرات کو محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ چھٹے ماہ سے بچہ آوازیں سن سکتا ہے، ماں کے جذبات کو محسوس کر سکتا ہے، اور اس پر ردعمل ظاہر کر سکتا ہے۔ ماں کی آواز، اس کا دل کی دھڑکن کی آواز، اور باپ کی آواز، یہ سب وہ پہلی چیزیں ہیں جن سے بچہ متعارف ہوتا ہے۔

ماں کا ذہنی دباؤ، اس کا غصہ، اس کی پریشانیاں - یہ سب بچے کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ جب ماں تناؤ کا شکار ہوتی ہے تو اس کے جسم میں کورٹیسول ہارمون خارج ہوتا ہے جو نال کے

ذریعے بچے تک پہنچتا ہے اور اس کی نشوونما پر منفی اثر ڈالتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں حاملہ خواتین کو درپیش مسائل کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ ایک طرف تو ہمارے ہاں حاملہ خواتین کی دیکھ بھال کی اچھی روایات ہیں، جیسے کہ خاص کھانوں کا اہتمام، آرام کا خیال رکھنا، اور بزرگ خواتین کے مفید مشورے لیکن دوسری طرف کئی ایسی غلط فہمیاں اور نقصان دہ روایات بھی ہیں جو ماں اور بچے دونوں کے لیے مسائل کا باعث بنتی ہیں۔

پاکستانی خاندانوں میں عام طور پر حاملہ خواتین کے جذباتی مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ان کی چڑچڑا پن اور جذباتی اتار چڑھاؤ کو معمول سمجھ لیا جاتا ہے، جبکہ درحقیقت انہیں خصوصی توجہ اور جذباتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر کے بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ حاملہ بیٹی، بہو یا بہن کے جذباتی اتار چڑھاؤ کو سمجھیں اور اسے ڈانٹنے یا تنقید کا نشانہ بنانے کے بجائے اس کی مدد کریں۔

رحم مادر میں تربیت درحقیقت ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کا پہلا اور اہم ترین قدم ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں اچھے، صالح اور ذمہ دار شہری پروان چڑھیں تو ہمیں اپنی توجہ رحم مادر کے مرحلے سے ہی بچوں پر مرکوز کرنی ہوگی۔ یہ وہ مقدس تربیت گاہ ہے جہاں انسان کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

پیدائش سے دو سال کی عمر تک

پیدائش سے لے کر دو سال کی عمر تک کے دور میں والدین کے رویوں کا بچے کی شخصیت پر انتہائی گہرا اثر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اس حوالے سے کئی ایسی غلطیاں اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جو بچے کی نفسیاتی اور جذباتی نشوونما کو شدید متاثر کرتی ہیں۔ مثلاً اکثر گھروں میں دیکھا گیا ہے کہ جب بچہ روتا ہے تو اسے "بگاڑ" سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ننھا بچہ جو اپنی بنیادی ضروریات کے اظہار کے سوا کچھ نہیں جانتا، اس کے رونے کو منفی طور پر لیا جاتا ہے۔ حالانکہ جدید نفسیات کے مطابق اس عمر میں بچہ کسی "بگاڑ" یا "شرارت" کے تصور سے ناواقف ہوتا ہے، وہ تو صرف اپنی جسمانی یا جذباتی ضرورت کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک اور عام رویہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بچے کو ماں کی گود سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس خوف سے کہ کہیں بچہ "گود کا عادی" نہ ہو جائے۔ یہ خیال درست نہیں کیونکہ جدید سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جسمانی قربت اور ماں کے دودھ کا تعلق بچے کے جذباتی تحفظ کی بنیاد ہے۔ جب بچہ ماں کے قریب ہوتا ہے، اس کا جسم ماں سے چمٹا ہوتا ہے، تو اس کے اندر ایک قسم کا جذباتی تحفظ

پیدا ہوتا ہے جو اسے مستقبل کی زندگی کے چیلنجز کے لیے تیار کرتا ہے۔

کئی گھروں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچے کے ساتھ بات چیت کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال کہ "یہ ابھی کیا سمجھے گا" در حقیقت بچے کی ذہنی نشو نما میں رکاوٹ بنتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جن بچوں سے زیادہ بات چیت کی جاتی ہے، وہ نہ صرف جلد بولنا سیکھتے ہیں بلکہ ان کی ذہنی صلاحیتیں بھی زیادہ تیزی سے نشو نما پاتی ہیں۔

ہمارے معاشرے کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ بچے کے جذبات کو سمجھنے کی بجائے انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب بچہ خوف زدہ ہو یا پریشان ہو، تو اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا جاتا ہے، حالانکہ اس عمر میں بچے کو سب سے زیادہ والدین کے جذباتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ عمر ہے جب بچہ اپنے آس پاس کی دنیا کو سمجھنا شروع کرتا ہے اور اسے والدین کی نرمی اور پیار بھری رہنمائی درکار ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں بزرگوں کے تجربے کا احترام ضروری ہے، لیکن ساتھ ہی جدید نفسیاتی تحقیق کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان دو سالوں میں بچہ اپنی پوری زندگی کی بنیاد تعمیر کر رہا ہوتا ہے۔ جس بچے کو ابتدا میں پیار اور تحفظ ملا ہو، وہ زندگی کے ہر موڑ پر مضبوطی سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر بچے کو ابتدائی عمر میں ہی جذباتی طور پر نظر انداز کیا جائے، تو اس کے اثرات اس کی پوری زندگی پر رہتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کے رونے کو سمجھیں، ان کی باتوں کو توجہ دیں، ان کے جذبات کو اہمیت دیں، اور انہیں یہ احساس دلائیں کہ وہ محفوظ ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر ہم ایک مضبوط اور صحت مند نسل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ آخر میں، حضور پاک ﷺ کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپ نے فرمایا: "تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔" ہمارے بچے ہماری امانت ہیں، اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس امانت کا صحیح طریقے سے خیال رکھیں۔

دو سے پانچ سال کی عمر تک

دو سے پانچ سال کی عمر کا دور بچے کی شخصیت سازی کا اہم اور حساس مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بچہ اپنے آپ کو "میں" کے طور پر پہچاننا شروع کرتا ہے اور ہر کام خود کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاکستانی معاشرے میں اس عمر کے بچوں کے ساتھ کئی ایسے نفسیاتی اور ذہنی صحت

کے حوالے سے غیر مناسب رویے اختیار کیے جاتے ہیں جو ان کی شخصیت کو مستقل طور پر مجروح کر دیتی ہیں۔

اس عمر میں بچے کی بنیادی نفسیاتی ضرورت "خود مختاری بمقابلہ شرم و شک" ہوتی ہے۔ بچہ ہر کام خود کرنا چاہتا ہے — خود کھانا، خود کپڑے پہننا، خود فیصلے کرنا۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر یہ رویہ دیکھنے میں آتا ہے کہ والدین بچے کی اس کوشش کو "ضدی پن" سمجھ کر ڈانٹ دیتے ہیں۔ مثلاً جب بچہ خود کھانا کھانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ڈانٹا جاتا ہے کہ "بیٹھو ٹھیک سے، سارے کپڑے خراب کر دیے"۔ حالانکہ درحقیقت یہ بچے میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا سنہری موقع ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے کا ایک اور المیہ بچوں کے درمیان موازنہ کرنا ہے۔ "دیکھو تمہارا بھائی کتنا اچھا ہے"، "خالہ کی بیٹی تم سے بہتر ہے" جیسے جملے بچے کے اندر حسد اور احساس کمتری پیدا کرتے ہیں۔ یہ موازنہ نہ صرف بچے کی خود اعتمادی کو مجروح کرتا ہے بلکہ بہن بھائیوں کے درمیان نفرت کے بیج بوتا ہے۔

اس عمر میں بچے کے جذبات کو سمجھنے کے بجائے عام طور پر انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب بچہ غصہ میں ہو یا رو رہا ہو تو ہمارے ہاں عام رد عمل یہ ہوتا ہے: "ارے یہ کیا بات ہے، چپ کرو"، "بڑے ہو گئے ہو، اب تو رونا چھوڑ دو"۔ حالانکہ درحقیقت بچے کو اس وقت سب سے زیادہ والدین کی ہمدردی اور سمجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بچوں کو ڈرانے دھمکانے کا رواج بھی عام ہے۔ "ڈاکٹر انجکشن لگا دے گا چپ ہو جاؤ جلدی سے"، "پولیس والا پکڑ لے گا" جیسے جملوں سے بچے کے اندر خوف اور بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ یہ خوف اکثر بچے کی پوری زندگی کا حصہ بن جاتا ہے اور وہ ہمیشہ ڈرا ہوا اور غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔

حدود کے تعین کے معاملے میں ہمارے ہاں دو انتہائیں پائی جاتی ہیں۔ یا تو بچے کو مکمل آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ کچھ بھی کرے، یا پھر اس پر اتنی پابندیاں لگا دی جاتی ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا ہی نہیں سکتا۔ درحقیقت بچے کو پیار کے ساتھ مناسب حدود میں رہتے ہوئے آزادی دینا اس کی صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

ہمارے ہاں ایک اور عام مسئلہ بچوں کو لیبل لگانے کا ہے۔ "تم بہت شرارتی ہو"، "تم سے کچھ نہیں ہو سکتا"، "تم تو بہت کم عقل ہو" جیسے لیبل بچے کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں اور وہ واقعی ایسا ہی بننے لگتا ہے۔

ان تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ والدین بچے کے ساتھ صبر اور حوصلے سے پیش آئیں۔ بچے کو چھوٹے چھوٹے فیصلے کرنے دیں، جیسے کہ کھانے کے لیے دو ڈشز میں سے ایک کا انتخاب، یا پہننے کے لیے دو قمیضوں میں سے ایک کا انتخاب۔ اس سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ بچے کے جذبات کو سمجھیں اور انہیں تسلیم کریں۔ جب بچہ غصہ میں ہو تو اسے یہ جملہ کہیں: "میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم ناراض ہو"۔

حدود کا تعین پیار اور نرمی سے کریں، سختی سے نہیں۔ بچوں کے درمیان کبھی موازنہ نہ کریں، ہر بچے کی انفرادی صلاحیتوں کو پہچانیں۔ انہیں ڈرانے دھمکانے کے بجائے پیار اور منطق سے سمجھائیں۔ سب سے بڑھ کر، خود ایک اچھا نمونہ بنیں کیونکہ بچے وہی سیکھتے ہیں جو وہ آپ کو کرتے دیکھتے ہیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی کی وہ تاریخی تحقیق جس نے والدین کے نظریے کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا

ہارورڈ یونیورسٹی کے چائلڈ ڈویلپمنٹ سینٹر کی ایک طویل المدت تحقیق نے ثابت کیا کہ زندگی کے پہلے پانچ سال درحقیقت انسان کی پوری شخصیت کی بنیاد طے کر دیتے ہیں۔ یہ تحقیق 1995 سے 2020 تک جاری رہی جس میں 1000 بچوں کا 25 سال تک مشاہدہ کیا گیا۔

محققین نے دو گروپس بنائے۔ پہلا گروپ ان بچوں پر مشتمل تھا جنہیں ابتدائی پانچ سال میں والدین کی جانب سے معیاری تعلیم و تربیت، جذباتی حمایت اور محبت بھرا ماحول ملا۔ دوسرا گروپ ان بچوں کا تھا جنہیں یہ سہولیات میسر نہیں تھیں۔

حیرت انگیز نتائج

ایم آر آئی اسکینز سے ثابت ہوا کہ جن بچوں کو ابتدائی سالوں میں بہتر ماحول ملا، ان کے دماغ کے ہپوکیمپس جو کہ یاداشت کا مرکز ہے، اس کا حجم 15 فیصد زیادہ تھا۔

پہلے گروپ کے بچوں میں ہائی سکول تک پہنچتے پہنچتے پڑھنے کی صلاحیت 68% بہتر تھی اور ریاضی میں ان کا اسکور 52% زیادہ تھا۔

جن بچوں کو ابتدائی سالوں میں جذباتی حمایت ملی، ان میں نوجوانی میں سماجی مہارتیں 45% زیادہ بہتر پائی گئیں۔

پہلے گروپ کے شرکاء میں ڈپریشن اور بے چینی کے امکانات 35% کم پائے گئے۔

ڈاکٹر جیک شونکوف، اس تحقیق کے سربراہ، کے مطابق ابتدائی پانچ سالوں میں دماغ میں ہر سیکنڈ سات سو سے ایک ہزار نئے نیورل کنکشن بنتے ہیں۔ یہ وہ سنہری موقع ہوتا ہے جب بچہ نہ صرف زبان

اور حرکات سیکھتا ہے بلکہ اس کے دماغ کی بنیادی ساخت طے ہوتی ہے۔ غربت یا نظر اندازی کا شکار بچوں کے دماغ کی نشو نما متاثر ہوتی ہے، جس کے اثرات زندگی بھر رہتے ہیں۔

یہ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ ابتدائی سالوں میں والدین کی ذمہ داری محض کھلانا پلانا نہیں، بلکہ ایک ایسا ماحول فراہم کرنا ہے جس میں بچے کا دماغ صحیح طریقے سے نشو نما پاسکے۔

دوسرا گروپ ان بچوں پر مشتمل تھا جنہیں ابتدائی پانچ سالوں میں مناسب دیکھ بھال، جذباتی حمایت اور تعلیمی مواقع میسر نہیں تھے۔ اس گروپ کے نتائج انتہائی پریشان کن تھے:

ایم آر آئی اسکینز سے معلوم ہوا کہ دوسرے گروپ کے بچوں کے دماغ کے ہیپو کیمپس (یادداشت کا مرکز) کا حجم 12-15% چھوٹا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دماغ کا وہ حصہ جو فیصلہ سازی کا ذمہ دار ہے اس میں بھی نمایاں کمی دیکھی گئی۔

یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو دوسرے گروپ کے بچوں میں دیکھی گئیں:

- پڑھنے کی صلاحیت میں 47% تک کمی
- ریاضی کے اسکور میں 52% کم کارکردگی
- ہائی سکول ڈراپ آؤٹ ریٹ 38% زیادہ
- نوجوانی میں سماجی مہارتوں میں 45% کمی
- دوست بنانے اور تعلقات قائم رکھنے میں دشواری
- ہم عمراں کے ساتھ جھگڑوں میں 60% اضافہ
- اسکول میں disciplinary issues زیادہ
- جوانی میں جرائم کی شرح 42% زیادہ
- تشدد کا رجحان 38% زیادہ پایا گیا
- ڈپریشن کے امکانات 35% زیادہ
- بے چینی کے disorders 42% زیادہ
- خود اعتمادی میں نمایاں کمی

دائمی بیماریوں کا خطرہ 28% زیادہ

- موٹاپے کا رجحان 31% زیادہ
- مدافعتی نظام کمزور پایا گیا

ڈاکٹر شونکوف کے مطابق، "دوسرے گروپ کے بچوں میں toxic stress کی وجہ سے

cortisolہارمون کی سطح مسلسل بلند رہتی تھی، جس نے ان کے دماغ کی نشونما کو بری طرح متاثر کیا۔ یہ بچے روزانہ کے تناؤ سے نمٹنے میں مصروف رہتے تھے، اس لیے ان کا دماغ سیکھنے اور نشونما پر توجہ نہ دے سکا۔"

ریسرچ میں یہ امید افزا بات بھی سامنے آئی کہ اگر ان بچوں کو بعد میں بھی supportive environmentملا تو وہ 70%تک improvement کر سکتے تھے، مگر ابتدائی پانچ سالوں کے نقصان کی مکمل تلافی ممکن نہیں تھی۔

یہ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ ابتدائی سالوں میں نظر اندازی کے اثرات زندگی بھر رہتے ہیں، اور ہمارے معاشرے کے لیے یہ انتباہ ہے کہ ہر بچے کو صحیح ماحول اور مواقع فراہم کرنا ہماری اجتماعی ذمہ داری ہے۔

ہمارے معاشرے میں اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ چھوٹا بچہ "کچھ سمجھتا نہیں"، لیکن یہ خیال بالکل درست نہیں۔ یہی وہ دور ہے جب بچہ بولنا چلنا سیکھتا ہے، جذبات کو سمجھتا ہے، تعلقات بناتا ہے، اور اپنے بارے میں تصور تشکیل دیتا ہے۔ اس نازک عمر میں والدین کا رویہ بچے کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ ایک پیار بھرا لمس، نرم آواز میں بولی گئی بات، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراہٹ، یہ سب بچے کے اندر دنیا کے لیے ایک بنیادی اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ یہ اعتماد ہی اسے مستقبل کی زندگی کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔

والدین کی حیثیت سے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھیں۔ ہماری مصروفیات، معاشی پریشانیاں، یا روزمرہ کے دباؤ ہمیں اس اہم ذمہ داری سے غافل نہ کر دیں۔ ہمارے بچے ہماری سب سے بڑی سرمایہ کاری ہیں۔ انہیں مہنگے کھلونے یا جدید سہولیات کی نہیں، بلکہ ہمارے قیمتی وقت، بے لوث محبت اور مستقل توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کے ساتھ کھیلنا، انہیں کہانیاں سنانا، ان کے سوالوں کے صبر سے جواب دینا، یہ سب وہ معمولی نظر آنے والے کام ہیں جو درحقیقت ان کی شخصیت کو پروان چڑھاتے ہیں۔

لٰہذا آیئے، اس عظیم امانت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے بچوں کے ابتدائی سالوں کو محبت، شفقت اور باخبر رہنمائی سے سنواریں۔ یہ ہمارا قرض ہے جو ہمیں اپنے بچوں کے اور اپنے رب کے حضور ادا کرنا ہے۔ کیونکہ یہی وہ وقت ہے جب ہم اپنے بچے کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنا سکتے ہیں۔

خوش اِخلاقی اور نفسیاتی صحت

عائشہ بتول

خوش خُلقی انسان کی شخصیت کا وہ جوہرِ لطیف ہے جو اس کے باطن کی طہارت، فکری بلندی اور اخلاقی تربیت کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ انسانی معاشرت میں حسنِ سلوک، نرم گفتاری اور رواداری کے فروغ کا بنیادی ذریعہ ہے۔ خوش اخلاق فرد نہ صرف اپنے کردار سے دوسروں کے دل جیت لیتا ہے بلکہ معاشرے میں امن، احترام اور باہمی اعتماد کی فضا قائم کرتا ہے۔ اسلام نے خوش خُلقی کو ایمان کا جزوِ لازم قرار دیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے بہترین وہ ہیں جن کے اخلاق بہترین ہیں۔“ (بخاری و مسلم)۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ "(القلم: 4)۔ ”اور بے شک آپ عظیم الشان خلق پر قائم ہیں۔“ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاقِ حسنہ وہ صفتِ کاملہ ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں کی اساس اور انسانی تکمیل کا معیار ہے۔

خوش خُلقی فرد اور معاشرے دونوں کی اصلاح و استحکام کے لیے ناگزیر ہے۔ ایک خوش اخلاق شخص اپنی نرمی، صبر، درگزر اور متانت سے دوسروں کے رویوں میں بھی مثبت تبدیلی پیدا کرتا ہے، جس سے اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔ خوش خُلقی کی اہمیت صرف مذہبی اور سماجی پہلوؤں تک محدود نہیں بلکہ اس کے گہرے نفسیاتی اور جسمانی فوائد بھی ہیں۔ جدید نفسیاتی

تحقیقات کے مطابق نرم مزاجی، معافی، مثبت طرزِ فکر اور مسکراہٹ انسان کے ذہنی تناؤ، غصے اور اضطراب کو کم کرتے ہیں جو انہیں مختلف نفسیاتی بیماریوں جیسے ڈپریشن اور بے چینی سے محفوظ رکھتا ہے۔اسی طرح خوش خُلقی جسمانی صحت پر بھی خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ یہ دل کی بیماریوں، ہائی بلڈ پریشر اور نیند کے مسائل کو کم کرتی ہے۔

خوش خُلقی کی تعریف

لفظ "خُلق" عربی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی عادت، مزاج، طبیعت یا سیرت کے ہیں۔ چنانچہ "خوش خُلقی" سے مراد دوسروں کے ساتھ نرمی، حسنِ سلوک، خوش گفتاری، در گزر، ہمدردی اور بھلائی کے ساتھ پیش آنا ہے۔ علمِ اخلاق کی اصطلاح میں خوش خُلقی ایک ایسی باطنی کیفیت یا عادت کو کہا جاتا ہے جو انسان کو بغیر کسی جبر، دکھاوے یا تصنع کے نیک اعمال اور مثبت رویّوں پر آمادہ کرے۔ یعنی انسان کا باطن اتنا پاکیزہ اور متوازن ہو جائے کہ اس سے خود بخود نرمی، انصاف، تحمل، شفقت اور خیر خواہی کے اعمال صادر ہوں۔ معروف ماہرِ نفسیات مارٹن سیلگمین (Martin Seligman) کے مطابق خوش اخلاقی "مثبت نفسیات (Positive Psychology) "کی اساس ہے، جو انسان کے ذہنی سکون، نفسیاتی توازن اور خوشحالی کو فروغ دیتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں خوش خُلقی کو ایمان کا بنیادی جزو قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“ (مسند احمد) اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں خوش خُلقی محض ایک سماجی خوبی نہیں بلکہ نبوتِ محمدی ﷺ کے مقاصد میں شامل ہے۔

خوش خلقی کے نفسیاتی اثرات

خوش اخلاقی کا تعلق مثبت سوچ اور جذباتی توازن سے

خوش خلقی انسان کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جو اس کے باطنی سکون اور ذہنی استحکام کی علامت بنتا ہے۔ ایک خوش خلق انسان نہ صرف دوسروں کے لیے راحت و اطمینان کا باعث بنتا ہے بلکہ خود اپنے اندر بھی ایک مثبت توانائی محسوس کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ مثبت رویہ اختیار کرنے والے افراد کے دماغ میں serotonin اور dopamine جیسے خوشی کے ہارمونز زیادہ متحرک رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں ذہنی سکون اور اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ خوش خلقی انسان کو منفی سوچ، حسد، غصہ اور انتقام جیسے تباہ کن جذبات سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوش مزاج اور مثبت فکر رکھنے والے افراد مشکلات میں بھی حوصلہ، صبر اور توازن کا مظاہرہ کرتے ہیں، جو ایک متوازن شخصیت کی علامت ہے۔

جدید نفسیات کی روشنی میں خوش خلقی کا کردار

جدید نفسیات (Modern Psychology) کے مطابق خوش خلقی صرف ایک اخلاقی یا سماجی خوبی نہیں بلکہ ایک نفسیاتی طاقت (Psychological Strength) بھی ہے، جو انسان کی ذہنی، جذباتی اور جسمانی تندرستی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ایک خوش اخلاق شخص عام طور پر زیادہ پُرسکون، خوداعتماد، اور متوازن ذہن کا حامل ہوتا ہے، کیونکہ اس میں منفی جذبات پر قابو پانے اور مثبت رویہ اپنانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

نفسیاتی ماہرین کے مطابق خوش اخلاقی انسان کے دماغ میں ایسے نیوروکیمیکل ہارمونز پیدا کرتی ہے جیسے ڈوپامین(Dopamine) ، سیرٹونن(Serotonin) ، اور آکسی ٹوسن (Oxytocin)، جو ذہنی سکون، اعتماد، اور اطمینان پیدا کرتے ہیں۔ یہ کیمیائی تبدیلیاں جسم میں (Stress hormones جیسے Cortisol) کو کم کرتی ہیں، جس سے تناؤ (Stress) میں کمی اور اطمینان (Satisfaction) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح خوش خلقی، مثبت رویے، اور ذہنی صحت کے درمیان ایک فطری اور سائنسی تعلق قائم ہوتا ہے۔

مثبت نفسیات (Positive Psychology) کا نظریہ

مثبت نفسیات، جدید نفسیات کی ایک معروف شاخ ہے جسے ڈاکٹر مارٹن سیلیگمین (Dr. Martin Seligman) نے متعارف کروایا۔ اس نظریے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد صرف ذہنی بیماریوں سے بچنا نہیں بلکہ خوشی، اطمینان، اور مثبت طرزِ زندگی کو فروغ دینا ہے۔

سیلیگمین کے مطابق، ہر انسان کے اندر ایسی فطری خوبیاں موجود ہیں جو اس کی خوشی، سکون اور ذہنی صحت کا ذریعہ بن سکتی ہیں، جیسے شکر گزاری (Gratitude) ، رحم دلی (Kindness) ، صبر (Patience) اور خوش اخلاقی (Good Conduct) ۔

تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ مثبت نفسیات کے اصولوں پر عمل کرنے والے افراد میں:

- ڈپریشن اور انگزائٹی کی شرح کم ہوتی ہے،
- قوتِ مدافعت بہتر رہتی ہے،
- اور ان کے سماجی تعلقات زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کی ایک تحقیق کے مطابق، روزمرہ زندگی میں چھوٹے چھوٹے نیک اعمال جیسے کسی کو مسکرا کر دیکھنا، شکریہ ادا کرنا، یا دوسروں کی مدد کرنا ذہنی خوشی (Subjective Well-being) میں نمایاں اضافہ کرتے ہیں۔

اسی طرح Emmons & McCullough (2003) کی تحقیق کے مطابق Gratitude اور Kindness-based behaviors کرنے والے افراد میں خوشی اور ذہنی اطمینان کی سطح غیر معمولی طور پر بلند دیکھی گئی۔

جذباتی ذہانت کا نظریہ

جذباتی ذہانت کا تصور ڈینیل گولمین نے 1990 کی دہائی میں پیش کیا۔ اس کے مطابق کامیاب اور متوازن زندگی کے لیے صرف عقلی ذہانت (IQ) کافی نہیں بلکہ جذباتی ذہانت (EQ) زیادہ اہم ہے۔

جذباتی ذہانت سے مراد ہے:

"اپنے اور دوسروں کے جذبات کو پہچاننے، سمجھنے، اور مثبت انداز میں استعمال کرنے کی صلاحیت۔"

اس نظریے کے مطابق، ایک جذباتی طور پر باشعور شخص اپنی اور دوسروں کی نفسیاتی کیفیت کو بہتر طور پر سمجھتا ہے، منفی احساسات کو قابو میں رکھتا ہے، اور مثبت انسانی تعلقات قائم کرتا ہے۔ گولمین کے مطابق Emotional Intelligence کے پانچ بنیادی اجزاء یہ ہیں:

1. خود آگہی: اپنے جذبات کو پہچاننا اور ان کے اثرات سمجھنا۔
2. نظم و ضبط: غصہ، حسد اور منفی احساسات پر قابو پانا۔

3. حوصلہ افزائی : مثبت مقاصد کے لیے مسلسل کوشش جاری رکھنا۔
4. ہمدردی : دوسروں کے احساسات کو سمجھنا اور ان کے ساتھ نرمی برتنا۔
5. Social Skills سماجی صلاحیتیں : تعلقات کو بہتر بنانا اور ہم آہنگی پیدا کرنا۔

خوش اخلاقی ان تمام اجزاء کے عملی اظہار کی علامت ہے۔ ایک خوش اخلاق شخص اپنے جذبات کو متوازن رکھتا ہے، دوسروں کے احساسات کا احترام کرتا ہے، اور سماجی تعلقات میں سکون و محبت پیدا کرتا ہے۔

خوش خلقی کے جسمانی و طبّی اثرات
مسکراہٹ، شکر گزاری اور خوش اخلاقی کے جسم پر سائنسی اثرات

جدید تحقیق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مسکراہٹ، شکر گزاری، اور خوش مزاجی محض اخلاقی یا سماجی اظہار نہیں بلکہ یہ جسمانی نظام (Physiological System) پر بھی مثبت اثر ڈالتی ہیں۔

مثلاً، Harvard Medical School کی 2019 کی تحقیق میں یہ ثابت کیا گیا کہ جو افراد روزانہ مسکراتے ہیں یا دوسروں سے نرم دلی سے پیش آتے ہیں، ان کے جسم میں Endorphins اور Serotonin کی مقدار بڑھتی ہے — جو قدرتی طور پر درد کم کرنے اور خوشی پیدا کرنے والے ہارمونز ہیں۔

اسی طرح University of California, Davis کی تحقیق میں یہ نتیجہ سامنے آیا کہ شکر گزاری کا مسلسل اظہار کرنے والے افراد کے دل کی دھڑکن میں توازن، نیند کے معیار میں بہتری، اور بلڈ پریشر میں کمی دیکھی گئی۔

یہ ثابت کرتا ہے کہ خوش خلقی اور شکر گزاری جسم کے خودکار نظام کو پر سکون اور متوازن بناتی ہے، جس سے مجموعی جسمانی صحت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

دل، دماغ اور قوتِ مدافعت پر خوش خلقی کا اثر

خوش خلقی نہ صرف دماغی سکون کا ذریعہ ہے بلکہ دل کی صحت اور قوتِ مدافعت (Immune System) کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔ Harvard T.H. Chan School of Public Health کی 2013 کی تحقیق کے مطابق، ایسے افراد جو دوسروں کی مدد کرتے ہیں یا مثبت سماجی تعلقات قائم رکھتے ہیں، ان کے جسم میں Inflammatory Markers کم پائے جاتے ہیں یعنی وہ مادے جو سوزش، دل کے امراض اور ذیابیطس کا سبب بنتے ہیں۔

اسی طرح (2015) Oxford University کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ باقاعدہ نیکی کے اعمال کرنے والے افراد میں Natural Killer Cells (مدافعتی خلیے) کی فعالیت میں اضافہ ہوتا ہے، جو جسم کو جراثیم اور وائرس سے بچاتے ہیں۔

مزید یہ کہ خوش خلقی سے خون میں آکسیجن کا بہاؤ بہتر ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں دماغ زیادہ متحرک، یادداشت بہتر، اور نیند زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔

دماغی صحت پر خوش اخلاقی کے اثرات کو Yale School of Medicine کی 2020 کی ایک تحقیق نے بھی سائنسی بنیادوں پر واضح کیا کہ نرم گفتاری اور ہمدردی جیسے جذباتی رویے دماغ کے Prefrontal Cortex اور Amygdala کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، جس سے غصہ، خوف، اور بے چینی میں کمی واقع ہوتی ہے۔

خوش اخلاقی پیدا کرنے کے عملی طریقے

1۔ خوداحتسابی، صبر، شکر اور مثبت سوچ

خوش خلقی کی ابتدا خود احتسابی سے ہوتی ہے یعنی انسان اپنے رویوں، جذبات اور ردِ عمل کا جائزہ لے۔ جب انسان اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کو پہچان لیتا ہے، تو اصلاح کی راہ کھلتی ہے۔ صبر انسان کو اشتعال، غصہ اور منفی ردِ عمل سے محفوظ رکھتا ہے، جب کہ شکر کا رویہ دل کو وسعت، اطمینان اور دوسروں کے لیے نرم روی کا احساس بخشتا ہے۔

اسی طرح مثبت سوچ (Positive Thinking) فرد کے اندر برداشت، عفو اور حسنِ ظن پیدا کرتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے خوش خلقی دراصل باطن کے سکون اور یقینِ قلب کا مظہر ہے، اور یہی کیفیت انسان کو دوسروں کے ساتھ نرمی و محبت سے پیش آنے کے قابل بناتی ہے۔

2۔ذکر، دعا اور صلہ رحمی کا کردار

قرآن و سنت کی روشنی میں ذکرِ الٰہی اور دعا انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے بنیادی ذرائع ہیں۔ ذکر دل کو نرمی عطا کرتا ہے اور انسان کو غفلت، تکبر اور خود پسندی سے پاک کرتا ہے، جبکہ دعا کے ذریعے بندہ اپنی اصلاح اور خُلقِ حسن کی طلب کرتا ہے۔

علاوہ ازیں صلۂ رحمی یعنی رشتہ داروں سے حسنِ سلوک خوش خلقی کی عملی صورت ہے۔ جو شخص رشتہ داری نبھاتا، معاف کرتا اور تعلقات کو جوڑتا ہے، وہ دراصل اپنے اندر اخلاقی نرمی اور روحانی پاکیزگی پیدا کرتا ہے۔

3۔جدید نفسیاتی طریقے: شعوری بیداری اور شکر گزاری

جدید نفسیات میں ایسے عملی طریقے متعارف ہوئے ہیں جو انسان کے اخلاقی اور جذباتی توازن کو بہتر بناتے ہیں۔ Mindfulness یعنی شعوری بیداری کا مطلب ہے کہ انسان اپنے خیالات، احساسات اور اعمال سے پوری طرح آگاہ رہے۔ یہ کیفیت غصے، حسد، یا منفی ردِ عمل کے بجائے وقار، تحمل اور ہمدردی کو فروغ دیتی ہے۔

اسی طرح Gratitude Journaling شکر گزاری کی یاددہانی ایک ایسی مشق ہے جس میں انسان روزانہ ان چیزوں کو لکھتا ہے جن پر وہ شکر گزار ہے۔ یہ عمل دماغ میں Serotonin اور Dopamine جیسے مثبت کیمیائی مادّوں کی افزائش کرتا ہے، جو سکون، مسرت اور خوش اخلاقی کو مستحکم کرتے ہیں۔

4۔معاشرتی و تعلیمی سطح پر کردار سازی کی ضرورت

خوش خلقی کی تربیت صرف فرد کا ذاتی معاملہ نہیں بلکہ یہ سماجی اور تعلیمی ذمہ داری بھی ہے۔ اسکول، تعلیمی ادارے، اور دینی مراکز کو محض علمی تربیت پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کردار سازی، صبر، تعاون، اور احترامِ انسانیت کی عملی مشقیں بھی کروانی چاہئیں۔ اساتذہ اور والدین کو بچوں میں ابتدائی عمر سے ہی اخلاقی ضبط، نرم مزاجی، اور خدمتِ خلق کے جذبات پیدا کرنے چاہییں۔ معاشرتی سطح پر ایسے ماحول کی تشکیل ضروری ہے جہاں محبت، رواداری، اور برداشت کی قدریں فروغ پائیں کیونکہ اجتماعی ماحول فرد کے اخلاق پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اسی فکر کے پیشِ نظر تحریک منہاج القرآن اول روز سے ہی افرادِ معاشرہ کی اخلاقی قدروں کو پھر سے زندہ کرنے اور مضبوط بنانے کے لیے کوشاں ہے اور قائدِ تحریک شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اسی نبوی مشن کے لیے اپنی زندگی صرف کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں حسنِ اخلاق عطا فرما کر، مخلوق کے لیے نفع رسانی کا باعث بنائے۔ آمین

خاندانی استحکام اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

سمیہ اسلام

اسلام دینِ فطرت ہے، جو انسان کی جسمانی، روحانی، معاشرتی، اور معاشی ہر پہلو سے راہنمائی کرتا ہے۔ اس نے معاشرتی تعلقات کو خاص اہمیت دی ہے، خاص طور پر نکاح جیسے مقدس ادارے کو نہایت حکمت و مصلحت کے اصولوں پر استوار کیا ہے۔ انہی اصولوں میں ایک اہم اصول "کفُو" یعنی "برابری" یا "ہم پلہ ہونا" کا ہے۔ اسلام نے نکاح میں کفُو کو اس لیے اہم قرار دیا تاکہ میاں بیوی کے درمیان ہم آہنگی، ذہنی سکون، اور تعلقات میں استحکام قائم رہے، اور بعد از نکاح زندگی میں کشیدگی، احساسِ کمتری یا نفرت جیسے عناصر نہ پنپ سکیں۔

کفُو کا مفہوم

"کفُو" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: ہم پلہ، برابر، یا مناسب۔ فقہی اصطلاح میں، "کفُو" سے مراد ایسا شخص ہے جو نکاح کے لیے دوسرے فریق کے لحاظ سے دین، نسب، مال، پیشہ، اخلاق اور عادات میں اس کے برابر یا قریب ہو۔

اسلام ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی کے اصول فراہم کرتا ہے۔ اسلام کے معاشرتی اصولوں میں ایک اہم تصور "کفُو" (برابری یا ہم پلہ ہونا) کا ہے، خاص طور پر نکاح کے معاملے میں۔ اسلامی شریعت میں

کفُو کا مطلب ہے کہ نکاح کے فریقین (دلہا اور دلہن) دینی، خاندانی، معاشرتی اور بعض اوقات مالی حیثیت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں تاکہ ازدواجی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو۔

شریعتِ مطہرہ میں کفُو کی اہمیت

قرآنی اشارات

اگرچہ قرآن مجید میں کفُو کے معاملے کو صراحت سے بیان نہیں کیا گیا، تاہم اللہ تعالیٰ نے مومنین کو خاص طور پر صالحین اور صالحات سے نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے:

وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور: 26)

یعنی: پاک مرد پاک عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں۔

یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ دین داری اور اخلاقی صفات کی برابری نکاح کے لیے موزوں بنیاد ہے۔

احادیث نبوی ﷺ

نبی کریم ﷺ نے نکاح میں دینی کفُو کو سب سے اہم قرار دیا۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إذا أتاكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه، إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض وفساد عريض(ترمذی)

”جب تمہارے پاس کوئی دین و اخلاق والا رشتہ آئے تو نکاح کر دو، اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔“

یہ حدیث واضح طور پر دین اور کردار کو کفُو کی بنیاد قرار دیتی ہے۔

نکاح میں کفُو کی اہمیت

اسلام نے نکاح کو ایک پاکیزہ، مقدس اور سماجی معاہدہ قرار دیا ہے، اور اس معاہدے کی پائیداری کے لیے ہم آہنگی (compatibility) بہت ضروری ہے۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے معیار سے بہت مختلف ہوں، تو اکثر ازدواجی زندگی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔

ا۔دین داری میں کفُو

سب سے اہم معیار دین داری ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اگر تمہارے پاس کوئی دین و اخلاق والا شخص نکاح کا پیغام لے کر آئے تو اس سے نکاح کر دو، ورنہ زمین میں فتنہ اور فساد ہوگا۔" (ترمذی)

۲۔نسب میں کفُو

اسلام میں نسب (خاندانی حیثیت) کا خیال رکھنا بھی ایک فطری امر سمجھا گیا ہے، تاکہ معاشرتی ہم آہنگی قائم رہے۔اگرچہ اسلام ذات پات کے نظام کو رد کرتا ہے، مگر خاندانی پس منظر کی ہم آہنگی ازدواجی زندگی کو آسان بناتی ہے۔

۳۔مالی حیثیت میں کفُو

مالی لحاظ سے بھی برابری کا خیال رکھنا اہم ہے تاکہ فریقین ایک دوسرے کی توقعات اور طرزِ زندگی کو سمجھ سکیں۔ایک بہت امیر اور ایک بہت غریب کے درمیان رشتے میں اکثر تفاوت پیدا ہوتا ہے جو مسائل کا باعث بنتا ہے۔

۴۔پیشہ یا سماجی حیثیت میں کفُو

بعض فقہاء نے پیشے اور معاشرتی مقام کو بھی کفُو کے زمرے میں شمار کیا ہے تاکہ زوجین کے درمیان کسی قسم کی احساسِ برتری یا کمتری پیدا نہ ہو۔کفُو کا مقصد تفریق نہیں، تحفظ ہے یہ بات قابل فہم ہے کہ اسلام میں کفُو کا مقصد کسی کو کمتر یا برتر ثابت کرنا نہیں بلکہ ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانا ہے۔اگر شوہر اور بیوی کے درمیان سوچ، اقدار اور پس منظر میں ہم آہنگی ہو تو ان کے درمیان محبت، تعاون اور صبر و برداشت کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔

آج کے دور میں کفُو کا اطلاق

موجودہ دور میں نکاح کے فیصلے میں اکثر ظاہری چیزوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور دین داری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً، نکاح کے بعد مسائل، طلاق، اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ جیسے معاملات بڑھتے جا رہے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ نکاح کے وقت دین داری کو اولین معیار بنایا جائے اور دیگر کفُو کے پہلوؤں کو بھی حکمت و بصیرت سے دیکھا جائے۔اسلام میں کفُو کا تصور نکاح کو پائیدار، خوشحال اور امن کا گہوارہ بنانے کے لیے دیا گیا ہے۔یہ کوئی امتیازی اصول نہیں بلکہ حکمت پر مبنی ایک فطری اصول ہے۔اگر اس پر عمل کیا جائے تو نہ صرف فرد کی زندگی خوشحال ہوگی بلکہ ایک مضبوط اور صالح معاشرہ بھی تشکیل پائے گا۔

آج کے دور میں والدین اکثر دین داری کو نظر انداز کر کے صرف مال و دولت یا ظاہری معیار کو اہمیت دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں نکاح دیر سے ہوتے ہیں، طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے، غیر متوازن ازدواجی تعلقات عام ہو گئے ہیں، اسلامی معاشرہ چاہتا ہے کہ نکاح آسان ہو، مگر پائیدار ہو۔ کفُو کا اصول اسی حکمت کے تحت دیا گیا ہے۔

کفُو کا غلط استعمال

بدقسمتی سے کچھ لوگ کفُو کے نام پر نسلی امتیاز، ذات پات، یا جاگیردارانہ نظام کو فروغ دیتے ہیں، جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"کوئی عربی کسی عجمی پر، اور نہ کوئی عجمی کسی عربی پر فضیلت رکھتا ہے، سوائے تقویٰ کے۔" (مسند احمد)

لہٰذا کفُو کا مطلب صرف سماجی برابری نہیں بلکہ دین داری، اخلاق اور حکمت پر مبنی ہم آہنگی ہے۔

آج کے دور میں نکاح سے پہلے لڑکا اور لڑکی کے تعلقات عام ہوتے جا رہے ہیں، جن میں جذبات، وقتی پسند یا ظاہری کشش کی بنیاد پر قربت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلام میں نکاح سے پہلے کسی قسم کے تعلق کی اجازت نہیں، کیونکہ اس میں نہ صرف اخلاقی اور دینی خرابی ہے بلکہ عملی طور پر بھی یہ رشتہ مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا۔ ایسے تعلقات میں زیادہ تر جذباتی یا ظاہری پسندیدگی کو اہمیت دی جاتی ہے، جبکہ دین، اخلاق، مزاج، خاندانی پس منظر اور زندگی کے نظریات جیسے اہم پہلو نظر انداز کر دیے جاتے ہیں — یہی وہ پہلو ہیں جو "کفو" یعنی برابری اور ہم آہنگی کے اصول کو متاثر کرتے ہیں۔

جب ایسے تعلقات شادی میں بدلتے ہیں، تو شروع کے چند دن تو جذباتی وابستگی کے سہارے گزر جاتے ہیں، مگر جیسے ہی عملی زندگی کے مسائل سامنے آتے ہیں، اختلافات، مزاج کی ناہم آہنگی، دینی کمزوری اور خاندانی دباؤ جیسے عوامل ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ چونکہ ابتدا میں کفو کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہوتا، اس لیے ایک دوسرے کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، نتیجتاً تعلقات میں تناؤ بڑھتا ہے اور آخرکار طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

اسلام نے کفو کے اصول کے ذریعے اسی خرابی سے بچاؤ کا راستہ بتایا ہے۔ نکاح محض جذبات یا خواہش کا نہیں بلکہ ایک ''ذمہ دارانہ معاہدہ'' ہے، جو تبھی مضبوط رہ سکتا ہے جب دونوں فریق ''دین، اخلاق اور خاندانی ہم آہنگی'' میں برابر ہوں۔ اگر نکاح سے پہلے کے تعلقات میں کفو کا لحاظ رکھا جائے یا ان تعلقات سے مکمل اجتناب کیا جائے، تو معاشرے میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح کو کم کیا جا سکتا ہے اور ازدواجی زندگیوں کو زیادہ پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔

اسلام کا تصورِ کفُو نکاح جیسے حساس ادارے کو استحکام، سکون اور خیر کی بنیاد پر قائم کرنے کے لیے ہے۔ شریعت کا یہ اصول نہ صرف انفرادی زندگی کے سکون کا ضامن ہے بلکہ پورے معاشرے کی فلاح و بہبود سے جُڑا ہوا ہے۔ اگر نکاح کے فیصلے میں دین داری، کردار، نسب، اور سماجی ہم آہنگی کا لحاظ رکھا جائے، تو ازدواجی زندگی خوشگوار، پُرسکون اور دیرپا بن سکتی ہے۔ اسلام ہمیں نہ صرف یہ سکھاتا ہے کہ کس سے نکاح کرنا چاہیے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ نکاح کی کامیابی کن بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، اور ان بنیادوں میں کفُو ایک اہم ترین اصول ہے۔

مراکزِ علم، چراغِ ہدایت

حافظہ سحر عنبرین

ابتدائیہ

زندگی ایک مسلسل سفر ہے، اور ہر سفر کے لیے زادِ راہ ضروری ہوتا ہے۔ مگر یہ سفرِ حیات صرف جسم کا نہیں، روح اور فکر کا بھی ہے۔ اس کے لیے سب سے قیمتی زادِ راہ علم ہے، اور علم کا سرچشمہ مطالعہ۔

کتاب انسان کی بہترین رفیق ہے — نہ تھکتی ہے، نہ شکایت کرتی ہے، مگر جو سننے والا دل رکھے، اسے جہانِ معانی سے آشنا کر دیتی ہے۔

مطالعہ، دراصل اس خاموش گفتگو کا نام ہے جو انسان اور علم کے درمیان جاری رہتی ہے، اور یہی گفتگو انسان کو شعور، فہم اور بصیرت کے مراتب تک لے جاتی ہے۔

مطالعہ: پہلی وحی کا پیغام

مطالعہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید کی پہلی وحی ہی ''اِقْرَأْ'' (پڑھ) کے حکم سے شروع ہوئی۔ یہ الفاظ انسانیت کی تاریخ میں علم کے سفر کا پہلا چراغ بنے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطالعہ صرف دنیاوی ترقی نہیں، بلکہ روحانی بلندی کا بھی ذریعہ ہے۔

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”علم کے بغیر انسان جانور کی مانند ہے۔“
علم انسان کو وہ روشنی عطا کرتا ہے جو دل کو منور اور زندگی کو بامقصد بناتی ہے۔

مطالعہ کا مقصد اور طریقہ

مطالعہ محض کتابوں کے اوراق پلٹنے کا عمل نہیں، بلکہ ایک عبادت ہے جو نیت کی پاکیزگی سے قبولیت پاتی ہے۔
اگر مطالعہ کا مقصد اللہ کی رضا، انسانیت کی فلاح، اور شعور کی بیداری ہو، تو یہی عمل انسان کو معرفتِ الٰہی تک پہنچا دیتا ہے۔

مطالعہ کے چند سنہری اصول

1. نیت کی خلوصیت : مطالعہ محض وقت گزاری نہیں، بلکہ رضائے الٰہی کی نیت سے ہو۔
2. مقصد کا تعین : ہر مطالعہ ایک واضح ہدف کے تحت ہو تاکہ علم بے ثمر نہ رہے۔
3. استقامت : مطالعہ کو عادت بنائیں، روزانہ اس کے لیے وقت مقرر کریں۔
4. درست انتخاب : ایسی کتب پڑھیں جو علم میں اضافہ کریں اور کردار میں نکھار پیدا کریں۔
5. عمل کے ساتھ علم : علم اگر کردار میں نہ اترے تو بوجھ بن جاتا ہے؛ اس لیے علم پر عمل لازم ہے۔

مراکزِ علم —— تہذیبوں کی بنیاد

مراکزِ علم صرف عمارتیں نہیں ہوتیں، یہ وہ مقامات ہیں جہاں فکر جنم لیتی ہے، کردار بنتے ہیں، اور قومیں اٹھتی ہیں۔
یہی مراکز علم و تحقیق کے چراغ جلاتے ہیں، یہی تربیت گاہیں قوموں کو جمود سے نکال کر حرکت اور خدمت کے راستے پر گامزن کرتی ہیں۔

مطالعہ اور عصرِ حاضر

آج جب دنیا تیز رفتار ترقی کی دوڑ میں مصروف ہے، تو مطالعہ کی عادت کم ہوتی جا رہی ہے۔ مگر یاد رکھیے ۔”جو قومیں مطالعہ سے دور ہو جاتی ہیں، وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔“ ”مطالعہ ہی وہ قوت ہے جو ذہن کو وسعت، دل کو گہرائی اور قوم کو استقامت بخشتی ہے۔“

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے پھر سے مراکزِ علم و عرفان بنیں، تو ہمیں مطالعہ کو دوبارہ اپنی زندگی کا معمول بنانا ہوگا۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
امن، اعتدال اور احیائے امت کے معمار

اس دورِ فتن میں بڑھتے ہوئے معاشرتی مسائل، بگڑتے رویے، اور عدمِ برداشت اس بات کا ثبوت ہیں کہ اعتدالِ فکر اور علمِ کردار کا دامن چھوٹ چکا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں تنگ نظری، فرقہ واریت اور تعصب نے قوم کے دلوں میں ایسی دراڑیں ڈالیں کہ ایک دوسرے کے مسالک اور عقائد کے ماننے والوں کو مسلمان کہنا بھی گوارا نہ رہا۔ ایسے انتشار اور نفرت کے ماحول میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے 1980ء میں اتحادِ امت اور اعتدال کی صدا بلند کی۔

آپ نے ''منہاج القرآن'' کے دروازے ہر مسلک، ہر طبقے اور ہر قوم کے لیے کھول دیے۔ آپ نے مناظرانہ کلچر کو ختم کر کے علمی مکالمہ اور دلائلِ قرآنی کا چلن عام کیا، یوں قوم کو نفرت کے اندھیروں سے نکال کر رواداری، علم و محبت کے نور میں داخل کیا۔

پیروی کا صراط

اگر اس عہدِ ظلمت میں امن کی کوئی روشنی دکھائی دیتی ہے، اگر امت میں دوبارہ امید کی کوئی کرن جاگی ہے تو یہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی فکر، ان کی بصیرت، ان کی قربانیوں، اور ان کے اخلاص کا ثمر ہے۔ آپ نے امت کو بتایا کہ علم کے بغیر امن نہیں، اور محبت کے بغیر ایمان مکمل نہیں۔

صالح معاشرہ کی تشکیل — مرکزِ علم کی روشنی میں

قوموں کی ترقی اور بقا محض دولت، طاقت یا سیاست سے نہیں بلکہ علم، اخلاق اور کردار سے وابستہ ہوتی ہے۔

جب دل علم سے روشن ہوں، ذہن فکر سے منور ہوں اور کردار ایمان کی خوشبو سے معطر ہو، تو معاشرہ خود بخود صالح بن جاتا ہے۔

علم دراصل وہ روشنی ہے جو انسان کو اپنے خالق، اپنے مقصدِ حیات، اور اپنی ذمہ داری کا شعور عطا کرتی ہے۔ اسی روشنی کو عام کرنے والے مراکزِ علم دراصل امت کے لیے وہ چراغ ہیں جو قوم کے

فکری اندھیروں کو دور کرتے ہیں، دلوں میں ایمان کی حرارت جگاتے ہیں، اور کردار کو سنتِ نبوی ﷺ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران:110)

یعنی: "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ امتِ مسلمہ کی اصل پہچان اصلاحِ معاشرہ ہے۔ نہ صرف خود نیکی اختیار کرنا بلکہ دوسروں کو نیکی کی دعوت دینا بھی ایمان کا فریضہ ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (بخاری)

"تم میں ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔"

یعنی اصلاحِ معاشرہ صرف علما یا اداروں کی نہیں بلکہ ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ لیکن علم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں۔

آج بھی اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ امن، پاکیزگی، عدل اور خیر کا گہوارہ بنے، تو ہمیں پھر سے علم اور اخلاق کے ان مراکز سے وابستہ ہونا ہوگا۔ مساجد میں تعلیم کے حلقے، گھروں میں قرآن و سنت کی فضا، خواتین و نوجوانوں کے لیے تربیتی مجالس ـــــ یہ سب دراصل صالح معاشرے کے ستون ہیں۔

منہاج القرآن کے مراکز علم

تحریک منہاج القرآن کے قیام کے مقاصد میں سے ایک بنیادی مقصد "ترویجِ علم اور اہتمامِ تربیت" ہے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ہر فرد تک علم کو پہنچانا، علم کے کلچر کو دوبارہ Revive کر کے علم کی ثقافت کو زندہ کرنا اور ہر شخص کو علم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرنا اور فرد کو خاندان اور معاشرے کا مفید رکن بنانا ہے۔

علم نور ہے اور نور کے بغیر ماحول اور زندگی ظلمت اور تاریکی ہوتی ہے۔ ہماری زندگیوں میں جتنی بھی مشکلات، تلخیاں اور الجھنیں ہیں ان کی ایک بڑی وجہ جہالت اور علم کا فقدان ہے۔

علم ایک ایسا انمول خزانہ ہے جو انسان کو صاف و شفاف سوچ اور بلند خیالات سے نوازتا ہے۔ یہ نہ

صرف عادات کو بدلتا ہے، بلکہ انسان کے اندر رویوں میں ایک مثبت انقلاب بھی برپا کرتا ہے۔ جب علم انسان کے حصے میں آتا ہے، تو اُس کے افکار و خیالات میں نیا شعور پیدا ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اُس کی زندگی میں نہ صرف بہتر تبدیلی آتی ہے، بلکہ وہ دوسروں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں بھی ایک واضح فرق محسوس کرتا ہے۔

علم انسان کے دل و دماغ میں وہ بیداری اور احساس پیدا کرتا ہے جو اسے صحیح راستے کی پہچان عطا کرتا ہے۔ یہ احساس انسان کو اُٹھ کھڑا ہونے، بلند ارادے بنانے اور نیک عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر علم نہ ہو تو انسان ان مراحل کو طے نہیں کر سکتا اور وہ زندگی کی حقیقتوں سے بے بہرہ رہ جاتا ہے۔

تو آیئے! علم و شعور کے ذریعے ایک فلاحی معاشرے کی تعمیر میں حصہ لیجئے، کیونکہ یہی وہ راہ ہے جو ہم سب کی ترقی اور کامیابی کی ضامن ہے۔

تحریک منہاج القرآن نے ہمیشہ روایتی تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ، علم کی ترویج کے لیے غیر روایتی ذرائع کو بھی اختیار کیا ہے۔ کبھی عوامی تعلیمی مراکز کے ذریعے گاؤں گاؤں میں تعلیم و تربیت کے مراکز قائم کیے، اور کبھی "آئیں دین سیکھیں" اور "عرفان القرآن کورسز" اور "Diploma in Quran Studies" جیسے پروگرامز کے ذریعے ملک کے کونے کونے تک قرآن و سنت کی تعلیمات پہنچائیں۔

آج تحریک منہاج القرآن ایک بار پھر افرادِ معاشرہ کی تعلیم، تربیت اور شعور کی بیداری کے لئے سکولز، کالجز، مدارس، اکیڈمیز، مساجد اور گھروں میں علمی مراکز قائم کر رہی ہے۔ حضور شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ نے افرادِ معاشرہ کی اصلاح اور اُن کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے آئندہ پانچ سالوں میں ملک بھر میں 25 ہزار مراکز علم کے قیام کا عزم فرمایا ہے۔

یہ عزم نہ صرف معاشرتی اصلاح کا پیش خیمہ ہے، بلکہ ایک ایسے روشن مستقبل کا آغاز ہے جہاں ہر فرد علم کی روشنی سے منور ہو گا اور معاشرہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہو گا۔

مرکزِ علم کے بنیادی اہداف

1. قرآنِ مجید کے معانی و مفاہیم کی گہری سمجھ بوجھ پیدا کرنا اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ پر عمل کی رغبت دلانا۔
2. اسلام کے حقیقی عقائد، افکار اور نظریات کی خالص اور مستند تعلیم فراہم کرنا۔
3. ذاتِ مصطفیٰ ﷺ سے قلبی محبت اور والہانہ عشق کا تعلق مضبوط کرنا، تاکہ اسی تعلق کے ذریعے اطاعت و اتباعِ رسول ﷺ کا جذبہ پروان چڑھے۔
4. معاشرے میں اسوہ حسنہ ﷺ کو انفرادی و اجتماعی سطح پر عملی صورت میں ڈھالنے کی جدوجہد کرنا۔
5. اخلاقی، روحانی اور معاشرتی تطہیر کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی تربیت دینا۔
6. افرادِ معاشرہ کی فکری و ذہنی بالیدگی، جسمانی طہارت اور صحتِ عامہ کا شعور بیدار کرنا۔
7. انسان دوستی، احترامِ آدمیت اور خدمتِ خلق کے جذبے کو پروان چڑھانا۔
8. روزمرہ زندگی سے متعلق فقہی رہنمائی فراہم کرنا تاکہ افراد دینی معاملات میں بصیرت حاصل کر سکیں۔
9. محض حقوق کا مطالبہ کرنے کی بجائے، فرض شناسی اور ذمہ داری کے احساس کو فروغ دینا؛ اس مقصد کے لیے حقوق و فرائض کی متوازن تعلیم پر زور دینا۔
10. معاشرے میں باہمی رواداری، اخوت، بھائی چارے، امن و آشتی اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینا۔

مرکزِ علم: ایک جامع علمی و تربیتی ماڈل

1. یہ مرکز، تربیت گاہ یا اکیڈمی کے طرز پر ایک ہمہ گیر عوامی علمی پلیٹ فارم ہو گا، جہاں علم و آگہی کے ساتھ تربیت کردار کا اہتمام کیا جائے گا۔
2. مرکزِ علم کا تعلیمی دورانیہ ایک سال پر مشتمل ہو گا، جسے تین سمسٹرز میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر سمسٹر کی مدت چار ماہ ہو گی، اور ہر سمیسٹر کے لیے مخصوص نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔

3. تدریس کا نظام ہفتہ وار دو گھنٹے پر محیط ہوگا۔ حلقہ جات کے منتظمین کو اختیار ہوگا کہ وہ مقامی حالات اور شرکاء کی سہولت کے پیشِ نظر تدریس کا وقت تقسیم کریں، مثلاً دو دن ایک، ایک گھنٹہ یا ایک ہی دن دو گھنٹے کی نشست رکھیں۔

پہلا سال: نصابِ تعلیم

مرکزِ علم کے ابتدائی مرحلے میں دس اہم اور جامع مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے، جو شرکاء کی دینی، اخلاقی، فکری اور شخصی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کریں گے۔ مضامین درج ذیل ہیں:

1. تجوید و قراءت —قرآن مجید کو درست مخارج اور قواعد کے ساتھ پڑھنے کی عملی تربیت۔
2. ترجمہ و تفسیر —قرآنِ حکیم کے معانی، مضامین اور پیغامِ ہدایت کو سمجھنے کی روشنی۔
3. حدیثِ نبوی ﷺ —اقوالِ مصطفیٰ ﷺ سے عملی زندگی کی رہنمائی حاصل کرنا۔
4. سیرتُ الرسول ﷺ —حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا جامع مطالعہ اور اسوہ حسنہ کی روشنی۔
5. فقہ —عبادات و معاملات سے متعلق ضروری شرعی مسائل کی تعلیم۔
6. ارکانِ ایمان —ایمان کے بنیادی اجزاء کی تفہیم اور اعتقادی تربیت۔
7. آداب و معاملات —اسلامی تہذیب و معاشرت کے آداب اور حسنِ سلوک کی تعلیم۔
8. افکار و نظریات —اسلام کے فکری و نظریاتی پہلوؤں کا تعارف اور جدید چیلنجز کا مقابلہ۔
9. شخصیت سازی —کردار، خود اعتمادی، قیادت اور اخلاقی صلاحیتوں کی تعمیر۔
10. اخوت و بھائی چارہ —اسلامی معاشرت میں اتحاد، یگانگت اور ہمدردی کی روح کو زندہ کرنا۔

یہ مرکز نہ صرف علم کا سرچشمہ ہوگا بلکہ کردار سازی، روحانی بالیدگی، فکری ارتقاء اور معاشرتی بہتری کی راہوں کا روشن مینار بھی ثابت ہوگا۔ آیئے، اس علمی و تربیتی سفر کا حصہ بن کر ایک صالح، باوقار اور بامقصد معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کریں۔

دعوتِ عمل

ہم چاہتے ہیں کہ ان تعلیمات کی روشنی میں مراکزِ علم و عرفان کا جال بچھایا جائے۔ جہاں ہر فرد، ہر عمر اور ہر طبقے کے لیے علم و تربیت کا در وا ہو۔ آیئے! آپ بھی اس مشنِ علم و امن کا حصہ بنیے۔ مردوں، خواتین، نوجوانوں اور بچوں کے لیے الگ الگ نصاب دستیاب ہے۔

اس کی تدریس، تربیت اور تعلیم کے لیے ہم سے رابطہ کیجیے تاکہ ہم مل کر ایک بااخلاق، باشعور اور باعمل قوم بن سکیں۔

الفیوضات المحمدیہ

(شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

دنیوی و برزخی زندگی میں امن و راحت کا وظیفہ: یَا بَادِئُ

فوائد و تاثیرات

اس وظیفہ کو پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ ہر طرح کی ظاہری و باطنی عیب سے بری کر دیتا ہے اور اسے جنت عطا فرماتا ہے، جو شخص سات (۷) دن مسلسل اس کا ورد کرے اللہ تعالیٰ اس کو امراض سے شفا اور آفات سے سلامتی عطا فرمائے گا۔ پس مرگ بھی اس کا جسم قبر میں سلامت رہے گا اور جس سے اسے محبت ہوتی ہے وہ اس کے پاس آتا رہے گا۔

عام معمول: اوّل و آخر ۱۱، ۱۱ مرتبہ درود شریف پڑھ کر اس کا ورد سو (۱۰۰) مرتبہ روزانہ کریں۔

اس وظیفہ کو حسب ضرورت ۱۱ دن، ۴۰ دن یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کے لئے جاری رکھ سکتے ہیں۔

نیک اولاد اور اعمال حسنہ کا وظیفہ: یَا مُصَوِّرُ

فوائد و تاثیرات

جو عورت بانجھ ہو وہ سات دن تک مسلسل روزے رکھے اور ہر روز غروب آفتاب کے بعد افطاری سے قبل اکیس (۲۱) مرتبہ اس وظیفہ کو پڑھ کر پانی پر دم کرکے پیئے تو اللہ تعالیٰ اسے اولاد سے نوازے گا۔اگر کوئی شخص ۱۰ بار روزانہ اس کو پڑھے تو صالح اولاد سے نوازا جائے گا علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے والے کا چہرہ روشن اور حسین کر دے گا اور اعمالِ صالحہ کی بجا آوری میں اس کی مدد کرے گا۔

عام معمول: اوّل و آخر ۱۱، ۱۱ مرتبہ درود شریف پڑھ کر اس کا ورد سو (۱۰۰) مرتبہ روزانہ کریں۔

اس وظیفہ کو حسب ضرورت ۱۱ دن، ۴۰ دن یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کے لئے جاری رکھ سکتے ہیں۔

وظیفہ برائے بخشش و مغفرت: یَا غَفَّارُ

فوائد و تاثیرات

اس اسم پاک کا وظیفہ کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بخش دے گا، اس کے اعمالِ بد کی پردہ پوشی فرمانے کے ساتھ ان کو اپنے ظاہری جمال سے ڈھانپ دے گا۔جو شخص جمعہ کے بعد اس وظیفہ کو اپنا معمول بنالے تو اس پر آثار مغفرت ظاہر ہو جائیں گے اور اگر کسی شخص پر غصہ کی کیفیت طاری ہوجائے تو اس وظیفہ کی برکت سے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

عام معمول: اوّل و آخر ۱۱، ۱۱ مرتبہ درود شریف پڑھ کر اس کا ورد سو (۱۰۰) مرتبہ روزانہ کریں۔

اس وظیفہ کو حسب ضرورت ۱۱ دن، ۴۰ دن یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کے لئے جاری رکھ سکتے ہیں۔

MY COMFORT PLACE

SAADIA BATOOL

In today's modern world, youth face numerous challenges leading to mental health disturbance. Financial catastrophes, economic, social and most importantly academic pressures, coupled with identity crisis and feelings of isolation, often cause severe anxiety, stress and downfall in life satisfaction. Whereas modern psychology has made significant advancements, there remains the dire need to strengthen inner peace, self-contentment, ethical values and self-awareness deep down into the soul.

Most commonly stress is defined as emotional and mental disturbance caused by external factors. Basically, it arises when we face a problem or challenge without finding an obvious solution. In other words, it happens when distressing and negative thoughts plague us about upcoming situations, events or tasks. Being modern young generation, we face these challenges on daily basis, so these high expectations, social comparisons, and the constant digital flow leave us restless and mentally fatigued.

In holy Quran, Allah Almighty addresses the stress as divine trial for mo’min in Surah Baqarah verse 155.

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۵)

‘Moreover, We will most surely test you with something of fear and hunger and loss of wealth, lives and fruits. And give glad tidings to the patient.’

Here, Allah Almighty reminds us that these tests are opportunities for internal grooming, spiritual refinement and strengthening our resolve. Through these divine trials, a true Muslim and Mo’min can become firm in true belief, resilient in soul, and patient in the face of adversity, earning the blessings and reward promised by Allah Almighty. Holy prophet Muhammad ﷺ always emphasized this in teachings that those tested frequently with calamities are dearer to Allah Almighty and they must believe and respond in accordance with Allah’s command as said in Surah Baqarah verse 156.

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱۵۶)

‘Those who, when a calamity befalls them, say: Indeed, to Allah, we belong, and to Him, we shall return.’

The greater the desire for Qurb e Illahi, (Nearness to Allah Almighty) and the higher the spiritual goal, would be more we will face trials, as Allah Almighty illustrates:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲۱۴)

(O believers!) Do you suppose that you shall enter Paradise, though the like of that (suffering) has not yet come to you, which was endured by those who passed away before you? Affliction and adversity befell them, and they were so (severely) shaken that even the messenger and the believers with him said: ‘When will Allah’s help arrive?’ Indeed, Allah’s help is ever near.

So, the beloved of Allah tested frequently in different manners for their love for Allah Almighty. Even the companions of Holy Prophet Muhammad ﷺ experienced sufferings and hardships to such extent that they demanded for Allah's help. All these trials are blessings for true mo'min as these tests shape resilience, istaqamat and faith in them, teaching that real success and Divine pleasure come through Taqwa, (God-consciousness) tawakul (Trust on Allah) and perseverance.

Another common natural response in youth is anxiety which becomes overwhelming when it is continuous and may lead to distress and critical mental health problems. In holy Qur'an, Allah Almighty highlights Khauf (fear) and Huzn (sorrow) are also common responses in human nature. Imam Ibn Qayyim Al Jauziyah explains that Khauf e Illahi or Khashiyat e Illahi guides a true believer, illuminates his heart, and directs towards Divine proximity. When stress and anxiety prolonged, they may indulge you in hopelessness and depression and severely affect the clarity of perception. In Holy Qur'an Surah Al Baqarah verse 10, Allah Almighty says

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔

There is a sickness in their hearts,

Here, Allah Almighyt is highlighting the destructive power of negative emotions such as grudges, envy, hypocrisy, and inner turmoil. All such emotions destroy you from deep inside and leave you in miserable condition for rest of life. Therefore, Allah Almighty advised believers to seek purification of heart and Ikhlas (sincerity) to get rid of spiritual heart diseases. In this context, Allah Almighty ordered us to seek help from Sabr (patience) and Salah (prayer) and He also emphasizes Khashiyat e Illahi as stated in Surah Al-baqarah verse 45.

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (۴۵)

Take recourse to patience and prayer. It may indeed be hard, except for the devoutly humble.

These divine instructions from Allah Almighty clearly direct us towards the prayer mat as the physical and spiritual locus where our weak souls may find inner peace, comfort, healing and calmness. If we reflect upon our own state, we perform ablution meticulously, offer prayer punctually, and recite dhikr, yet our hearts frequently feel distant. Our tongues recite but we failed to feel the real taste of dhikr e Illahi and soul does not tremble with khashiyat e illahi. During prayer, our mind drifts endlessly into worldly distractions. In-spite of this, we find ourselves standing on prayer mat, wishing to feel that we are not in this materialistic world but in front of our Allah Almighty. We yearn for that precious presence, where our body trembles as we recognize the majesty of the Most Supreme. We desire for that moment from the core of our heart, when we cannot see, hear or feel anything else but Him, immersed in His beauty, feels His love for His servants, as if the entire world around us has faded.

The prayer mat, in this sense, becomes our true comfort zone, a silent companion to our feeble and wounded souls. It becomes a place for us where our anxieties dissolve, and the heart can speak freely to our beloved Allah Almighty. Our beloved Holy Prophet Muhammad ﷺ frequently affirmed the profound significance of Salah.

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِى فِى الصَّلَاةِ۔

(The coolness of my eyes lies in prayers)

(Sahih al-Bukhari, 3939; Sahih Muslim, 1823)

The prayer mat is not a ritualistic object but a sanctuary for the soul, an intimate space where one learns the meaning of patience, trust, and devotion.

Shaykh ul Islam Dr Muhammad Tahir ul Qadri beautifully describes that the real essence of prayer does not reside in physical movement of body only, but it lies in Hudoor e Qalb (the presence of heart). Salah (prayer) without Ikhlas and heartfelt presence is just like a body without soul and it's also true for all deeds as well. Imam al-Ghazali narrates that Ghaflah (heedlessness) in remembrance and worship of Allah Almighty blinds our hearts from the nearness of Allah, while Hudoor e Qalb opens the door to divine light for us.

Prof Dr Allama Iqbal addresses the performing of worship without spiritual awareness in following words. He calls the youth to rise beyond ritualism, to awaken their blind hearts to divine love and taste the sweetness of Dhikr e Illahi.

ترا امام بے حضور، تری نماز بے سرور　　　ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

Thy imam is without presence, thyprayer without ecstasy—Reject such a preyer, reject such an imam (Zarb-e-Kalim)

Mawlana Rumi describes this sacred longing beautifully:

"When I am with You, we stay up all night.

When You are not here, I can't go to sleep.

Praise be to God for these two in somnias —

and the difference between them."

The prayer mat is that threshold between two worlds — the material and the Divine. There, the heart learns to see without eyes, to listen without ears, to speak without words. There, the world dissolves, and only Allah remains.

Every sincere prostration in front of Allah Almighty becomes an act of healing, every precious moment of focused Dhikr e Illahi transforms anxiety into serenity as Allah Almighty states that in Surah ar-Ra'd verse 28.

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸)

Indeed, it is by Allah's remembrance that hearts find peace.

In this way, the prayer mat, then, is not merely a material object; rather it becomes a spiritual anchor. It's the place where we may find relief from fear and distress, cultivate patience, and experience the sweetness and fragrance of divine remembrance. It's the place where our restless soul finds rest from worries of materialistic world.

Standing on the prayer mat, we can transcend the noise of worldly echoes. Our body bows down, lips recite, and the heart gradually awakens to presence of Allah Almighty. In such sacred moments, time slows, and the Divine becomes profound. Allah Almighty reminds us in our distress that His help is near, guides us to strength and steadfastness. We are called to reclaim our connection, to turn our anxieties into devotion, and to make our prayer mat a sanctuary for our hearts.

If I reflect upon my personal struggle with my heedless prayers, there is still hope. Indeed, the yearning to reconnect is itself a mercy from Allah Almighty, a signal that the heart still seeks Him, and soul still remembers. May every young believer hear the whisper: return to your Allah Almighty, stand in front of Lord, bow down to prostrate, speak, weep, and listen to Divine echoes. The wounded heart only then rediscovers its home, and feeble soul awakens to infinite presence of Allah.

True comfort, true solace, and true joy lie not in worldly achievements, social acceptance and transient pleasure. Literally, they lie in standing on prayer mat, offering your Salah in true sense with Khashu o Khadu, (humility and submission) immersing yourself in remembrance of Allah, and finding a refuge where heart, mind, and soul get covered in internal peace. It is concluded that modern youth, burdened by trials, anxiety, and disconnections, can rediscover the Divine light of Sabr, Ikhlas, and proximity – transforming the prayer mat into a heaven, a sanctuary, and a best friend.

COMPASSION FOR ANIMALS A SEERAH-BASED PERSPECTIVE

SADAF MAQBOOL

Introduction

The ethical treatment of animals has gained increasing global attention, with debates surrounding animal rights, cruelty prevention, and environmental preservation. However, the principles that modern law now attempts to institutionalize were exemplified in their purest form more than fourteen centuries ago by the Prophet of Islam ﷺ. His teachings on mercy were not confined to human beings but extended to every living creature.

The Qur’an repeatedly draws human reflection toward animals, describing them as signs (*āyāt*) of Allah’s power and artistry. It emphasizes that animals form part of the moral and spiritual ecosystem of the universe. Allah ﷻ declares:

"There is no creature on earth nor a bird that flies with its wings but *are communities like you." (Surah Al-An'am, 6:38)*

The Prophet Muhammad ﷺ actualized this Qur'anic worldview in his daily life. His compassion toward animals was not occasional sentiment but an essential part of his mission as "Rahmatun lil-'Alameen" (Mercy for all the worlds) — encompassing humans, animals, and nature alike.

1. Qur'anic View of Animal Life

The Qur'an introduces animals as conscious beings who glorify their Creator:

*"There is not a thing but celebrates His praise, though you do not understand their glorification." (Surah Al-*Isra, 17:44)

This verse conveys that animals are not mere biological entities but spiritual beings participating in divine worship.

2. Prophetic Character: Embodiment of Mercy

The Prophet ﷺ's conduct demonstrates mercy that transcended all boundaries. He considered animals part of Allah's creation deserving care and justice. He said:

"The merciful are shown mercy by the Most Merciful. Be merciful to those on earth, and the One above the heavens will have mercy upon *you." (Sunan al-*Tirmidhi, Hadith 1924)

This hadith universalizes compassion — extending it to "those on earth," not only humans.

3. Examples of the Prophet's ﷺ Kindness to Animals

a) The Crying Camel

Hazrat Abdullah ibn Ja'far (RA) narrates:

"The Prophet ﷺ entered a garden of the Ansar. A camel saw him and began to whimper, its eyes overflowing with tears. The Prophet ﷺ approached it, stroked its head until it calmed, and said, *'Who is the owner of this camel? It has complained to me that you starve it and overwork it. Fear Allah concerning these dumb animals.'*"(Sunan Abu Dawood, Hadith 2549)

b) The Story of the Cat

The Prophet ﷺ's affection for cats is well known. One of His companions, Abu Hurairah (RA) — "the father of kittens" — received his title due to his love for cats, encouraged by the Prophet ﷺ.

He ﷺ warned against cruelty with severe consequences:

"A woman was punished in Hell because she imprisoned a cat till it died. She neither fed it or let it eat from the earth."(Sahih al-Bukhari, Hadith 3318)

c) Reward for Kindness

In contrast, mercy to animals earns divine forgiveness:

"A man saw a dog panting with thirst. He went down a well, filled his shoe with water, and gave it to the dog. Allah appreciated this deed and forgave him."(Sahih al-Bukhari, Hadith 2466)

hen the Companions asked, "O Messenger of Allah, is there a reward for us in serving animals?" He replied:

"There is reward for showing kindness to every living creature." (Sahih Muslim, Hadith 2244)

This Hadith universalizes compassion, making it an integral act of worship.

4. Ethical Framework of Animal Welfare in the Sunnah

The Prophet ﷺ not only displayed personal kindness but established principles that later guided Islamic law (Fiqh) and ethics.

The fuqaha (jurists) later cited the above mentioned Hadith in discussions on hunting, wildlife protection, and ethical conduct toward animals. For example, Imam al-Nawawi mentioned it in Sharh Sahih Muslim under the chapter *"Prohibition of Taking Young Ones from Their Mother Birds."*

a) Feeding and Caring

He)SAW) said:

"It is a great sin for a man to keep an animal and not feed it properly."(Sunan al-*Nasa'i, Hadith 4446)*

b) Prohibition of Cruelty for Entertainment

The Prophet ﷺ forbade hunting or harming animals for sport:

"The Messenger of Allah ﷺ cursed the one who takes any living thing as a target."(Sahih Muslim, Hadith 1958)

c) Humane Slaughter (Zabiha)

Even during slaughter, Islam emphasizes mercy and precision:

"Verily, Allah has prescribed excellence (ihsan) in all things. So when you kill, kill well; when you slaughter, slaughter well. Let one of you sharpen his knife and let the slaughtered animal's suffering be reduced."(Sahih Muslim, Hadith 1955)

d) Rights of Working Animals

He ﷺ said:In another narration, he rebuked a man sitting idly on his camel, saying:

"Do not take them as chairs for conversation. Allah has made them subject to you only to reach places you could not reach without them."(Ahmad ibn Hanbal, Musnad, Vol. 3)

5. Contemporary Relevance

In the modern age, humanity faces moral decline in its treatment of animals — from industrial farming and laboratory testing to deforestation and habitat loss. The Prophet ﷺ's teachings on balance (Mizan) and stewardship (Khilafah) offer timeless solutions.

The Islamic concept of "Amanah" (trust) defines humans as caretakers, not exploiters, of creation. This responsibility extends to protecting ecosystems, preventing animal cruelty, and ensuring sustainable use of resources. Modern Muslims can revive these Prophetic values through ethical consumption, environmental activism, and compassionate treatment of domestic and wild animals alike.

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی معرکہ آراء تصانیف

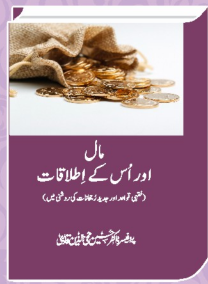

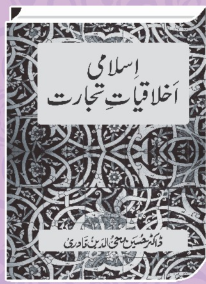

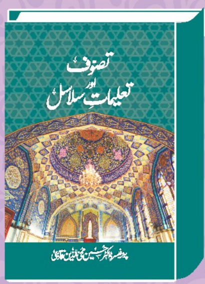

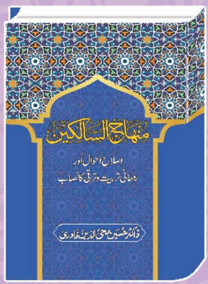

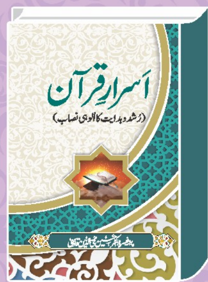

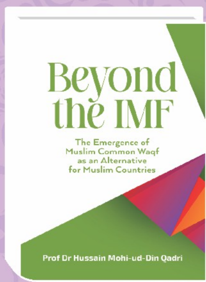

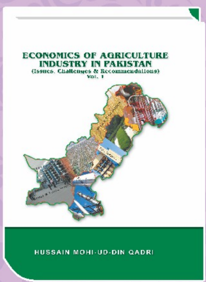

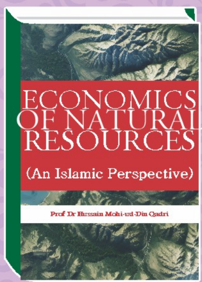

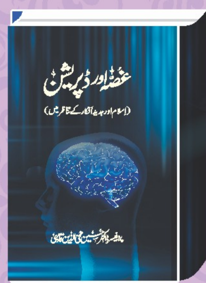

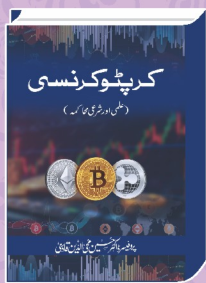

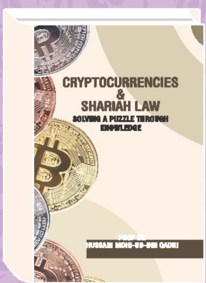

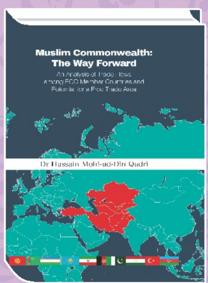

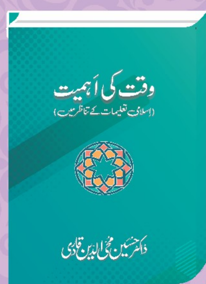

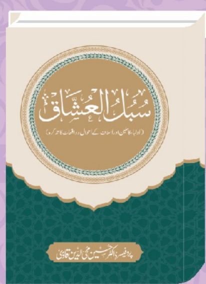

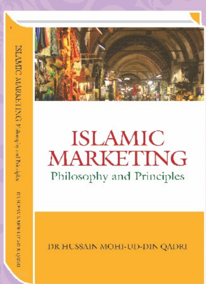

Monthly
DUKHTARAN-E-ISLAM
NOV-2025
LAHORE
Regd CPL No.45

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی معرکہ آراء تصانیف

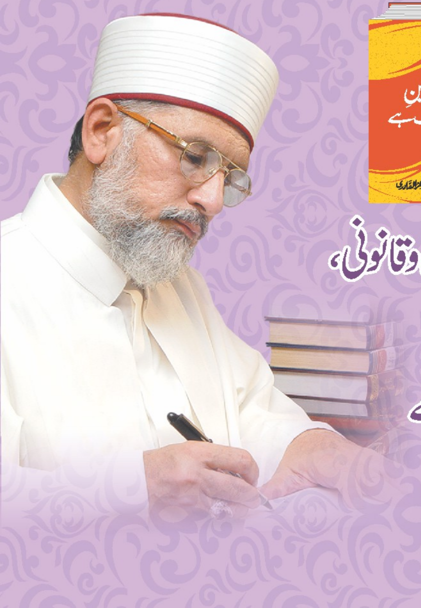

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی، فقہی و قانونی،
انقلابی اور فکری و عصری موضوعات پر
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی 650 سے
زائد کتب دستیاب ہیں